بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد نمبر ۸۳ | ماہ مارچ ۲۰۱۵ء مطابق جمادی الاوّل ۱۴۳۶ھ | شمارہ نمبر ۳

مدیر

خلیل الرحمان سجاد نعمانی E-mail : ilm.zikr@yahoo.com

اس شمارہ میں

	مضامین	مضامین نگار	صفحہ نمبر
۱	نگاہ اولیں	مدیر	۳
۲	محفل قرآن	مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی	۷
۳	دور حاضر اور علماء کی ذمہ داریاں	مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی	۱۷
۴	اجتہاد.... ضرورت، اہلیت اور دائرۂ کار	مولانا محمد اکرم قاسمی	۲۹
۵	حضرت نانوتویؒ کی دینی حمیت اور موجودہ دور میں اس کی ضرورت واہمیت	مولانا محمد ابوبکر قاسمی	۴۰
۶	الفرقان کی ڈاک		۵۵

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ V.P. ارسال کیا جائے گا جس میں آپ کے -/35 روپے زائد خرچ ہوں گے — منیجر

ضروری اعلان

مختلف مقامات میں ماہنامہ الفرقان کی توسیع اشاعت کے ذمہ دار حضرات کے نام اور فون نمبر نیچے لکھے جا رہے ہیں ان مقامات نیز قرب وجوار کے حضرات ان سے رابطہ قائم کریں۔

مقام	نام	فون نمبر
۱۔ بڑودہ (گجرات)	مفتی محمد سلمان صاحب	+91-9898610513
۲۔ مالیگاؤں (مہاراشٹرا)	مفتی حسین محفوظ صاحب	+91-9226876589
۳۔ بیلگام (کرناٹک)	مولانا تنویر صاحب	+91-9880482120
۴۔ بیڑ (مہاراشٹرا)	قاسمی بک ڈپو طہٰ بک ڈپو الطاف بک ڈپو	+91-9960070028 +91-9326401086 +91-9325052414-9764441005
۵۔ گورکھپور (اتر پردیش)	مکتبہ ناصر	+91-9451846384
۶۔ جالنا (مہاراشٹرا)	محمد اظہر	+91-9225715159

ناظم شعبۂ رابطہ عامہ : بلال سجاد نعمانی
E-mail: nomani_sajjadbilal@yahoo.com

☆ سالانہ زر تعاون، برائے ہندوستان: (سادہ ڈاک) عمومی -/Rs.200

☆ سالانہ زر تعاون برائے ہندوستان: (بذریعہ وی پی [1]) عمومی -/Rs.230

[1] اس صورت میں پہلے سے زر تعاون بھیجنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ رسالہ وصول کرتے وقت ڈاکیہ کو مطلوبہ رقم ادا کرنی ہوتی ہے،
مگر خیال رہے کہ وی پی نہ وصول ہوئی تو ادارہ کو -/Rs.40 کا نقصان ہوتا ہے

☆ سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک (بذریعہ ہوائی جہاز) -/20 پاؤنڈ۔ -/40 ڈالر

لائف ممبرشپ: ہندوستان: سادہ ڈاک -/Rs.8000۔

بیرونی ممالک: -/600 پاؤنڈ۔ -/1200 ڈالر۔

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ : **Mr. RAZIUR RAHMAN**
90-B HANLEY ROAD. LONDON N4 3DW U.K
Fax & Phone:020 72721352. Email:furqanpublications@googlemail.com

❁ ادارہ کا مضمون نگار کی فکر سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔ ❁

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ الفرقان
۳۱/۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ
پن-۲۲۶۰۱۸ - یوپی، انڈیا- فون نمبر: Ph:0522-4079758

MonthlyALFURQAN
114/31, NAZIRABAD LUCKNOW
Pin-226018- U.P INDIA
e-mail : monthlyalfurqanlko@gmail.com

دفتر کے اوقات صبح ۱۰ بجے سے ۱ بجکر ۳۰ منٹ بعد ظہر: ۲ بجے سے ۵ بجکر ۳۰ منٹ تک
اتوار کو آفس بند رہتا ہے ------

خلیل الرحمن سجاد کے لیے پرنٹر و پبلشر محمد حسان نعمانی نے کاکوری آفسیٹ پریس کچہری روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱/۱۱۴ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نگاہ اولیں

مدیر

آج ۱۱/فروری ۲۰۱۵ء کو جب کہ راقم الحروف مارچ کے شمارے کے لئے اداریہ لکھنے بیٹھا ہے اور پورے ملک کا عام آدمی بی جے پی کی شکست کا جشن منا رہا ہے، اور بی جے پی اور آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیموں کے قائدین پر موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے، راقم کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک بات بڑی شدت سے یاد آرہی ہے، ایک بار انہوں نے دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی مجلس عاملہ کی صدارتی تقریر میں کہا تھا:

> ''بارہا کا تجربہ ہے کہ جب کبھی ہندوستانی مسلمان شدید خطروں میں گھر جاتے ہیں، اور بظاہر تمام راستے مسدود نظر آنے لگتے ہیں تو اچانک اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ان کے لئے اس جانب سے راستہ کھول دیتی ہے جہاں راستہ نکلنے کی کوئی امید بھی کسی کو نہیں ہوتی ہے۔ اور ایسے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں کہ جن سے اگر فائدہ اٹھالیا جائے تو ملک وملت کے حالات میں ٹھوس اور دیرپا تبدیلی لائی جاسکتی ہے''

۱۰/فروری ۲۰۱۵ء سے پہلے کی صورت حال

۱۶/مئی ۲۰۱۴ء کو جب پارلیمانی انتخابات کے نتیجے میں بی جے پی کو ملک میں مضبوطی کے ساتھ اقتدار حاصل کرنے کا موقع ملا تو مسلمانوں کے اندر فکر وتشویش بلکہ خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی —— تاہم نتائج کا اعلان ہوتے ہی جب وزیر اعظم کے عہدے کے لئے پہلے سے نامزد شری نریندمودی نے پے در پے اپنی مسلسل تقریروں میں نہایت مثبت رویہ کا اظہار کرنا شروع کیا اور پھر کم از کم تقریروں کی حد تک۔ انہوں نے اپنی زیادہ تر توجہ ملک کی ترقی، صفائی ستھرائی، روزگار، نوجوانوں کی صلاحیتوں کے استعمال، بچیوں کو اچھی اور محفوظ زندگی کے حق جیسے بنیادی مسائل پر مرکوز رکھی، تو بہت بڑی تعداد میں لوگوں کے دلوں سے تشویش اور خوف دور ہونے لگا، اور ایسے لوگوں کی تعداد میں روز اضافہ ہوتا ہوا نظر آنے لگا جن کے

دلوں میں یہ امیدیں پیدا ہونے لگیں کہ شاید یہ شخص آہستہ آہستہ اپنی پارٹی ہی کو اس فسطائی ذہنیت سے دور کر لینے میں کامیاب ہو جائے جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے لئے نہایت نقصان دہ ہے بلکہ جو ملک کے عام آدمی کی بھی سوچ اور ترجیحات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اور جو بحیثیتِ مجموعی ملک کے عوام کی اکثریت کے لئے بھی مختلف پہلوؤں سے سخت مضر ہے۔

مگر ہوا یہ کہ ایک طرف تو وزیر اعظم میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے اور دوسری طرف جس پریوار سے ان کا تعلق ہے اس کے مختلف دھڑے نفرت کا زہر پھیلانے کے لئے نت نئے حربے استعمال کرتے رہے۔ کسی نے ملک کے باشندوں کو ''**رام زادوں**'' اور ''**حرام زادوں**'' کے مہذب نام دینے شروع کر دیے، کسی نے صدا لگائی کہ ہر ہندو عورت چار بچے پیدا کرے، دوسرے نے کہا چار سے کام نہیں چلے گا دس بچے پیدا کرنے پڑیں گے —— کچھ بہادر کھڑے ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ''**گھر واپسی**'' کے نام پر ہندو بنانے کا ڈرامہ رچنا شروع کر دیا —— مسجدوں پر حملے اور گرجا گھروں کو توڑنے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا، رام مندر کی جلد از جلد تعمیر کا نعرہ لگنے لگا —— یوگیوں اور سادھویوں کو پارلیمنٹ سے لے کر ملک کے طول و عرض میں گھوم گھوم کر نفرت کی آگ بھڑکانے کی کھلی چھوٹ مل گئی —— یہی نہیں، بلکہ اس پوری فوج کے سپہ سالار نے اعلان کر دیا کہ ہمارا ملک ہندو راشٹر ہے اور جو یہاں رہے وہ ہندو بن کر رہے، یہاں تک کہ انڈین اکسپریس ۱۰/فروری ۲۰۱۵ء کے بمبئی ایڈیشن کے صفحہ ۴ پر شائع ہونے والی خبر کے مطابق عیسائیوں کی طرف سے دائر ایک مقدمے کی سماعت کے دوران سپریم کورٹ کے ججوں نے بھی ملک کے رخ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ ''انڈیا ابھی تک تو سیکولر ملک ہے۔۔۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ کب تک سیکولر رہے گا؟۔۔۔ بہت سے مسائل کھڑے ہو چکے ہیں۔۔۔[1]''

قصہ مختصر ایک طرف ملک تیزی کے ساتھ باہمی خانہ جنگی کے راستہ پر ڈھکیلا جا تا رہا ہے اور دوسری طرف بہت زیادہ بولنے کے لئے بدنام وزیر اعظم نریندر مودی نے ملک کی اس صورت حال پر معنیٰ خیز اور پر اسرار خاموشی کا رویہ اپنائے رکھا۔۔۔ یہاں تک کہ یہ خیال عام ہونے لگا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب

---

[1] اس مقدمہ کی سماعت کے دوران اخبار مذکور کی رپورٹ کے مطابق ججوں نے اسی سلسلۂ گفتگو میں آگے چل کر جو کچھ اور کہا تھا اس کی وجہ سے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ جلد از جلد اس مقدمہ کی تفصیلات اور اس کے متوقع فیصلے کے اثرات کا جائزہ لے، ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں کوئی ایسی صورت حال سامنے آجائے جس سے حکومتِ وقت کو ایسی قانون سازی کا موقع مل جائے جس کی براہ راست زد پورے مسلم پرسنل لاء بورڈ پر پڑے۔

حکومت ہی کی شہ پر اور اس کی سوچی سمجھی پالیسی کی بنیاد پر ہی ہو رہا ہے۔۔۔اور جیسے جیسے یہ خیال عام ہونے لگا ملک کا وہ ''**عام آدمی**'' جس نے ۹ ماہ پہلے بڑے زور وشور سے مودی جی کو ملک کا اقتدار سونپا تھا، وہ بڑی تیزی کے ساتھ مودی سے دور ہونے لگا، اس لئے کہ اس ''**عام آدمی**'' نے اپنی پرانی وفاداریاں بدل کر مودی جی کو جو اقتدار سونپا تھا، وہ ہرگز ہرگز اس احمقانہ ہندوتوا کے مقاصد کے حصول کے مقصد سے نہیں، بلکہ ان نعروں اور وعدوں پر یقین کر کے سونپا تھا، جن کے نام پر مودی نے پورے الیکشن کی مہم کے دوران عوام سے ووٹ مانگے تھے۔اور غیر معمولی مہارت اور تسلسل کے ساتھ مانگے تھے، اور میڈیا نے بھی ان کی ایک ایک بات کو ہر کچے پکے گھر تک پہونچانے کے سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا تھا۔

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، عوام نے صرف ۹ ماہ کے عرصہ میں دیکھ لیا اور جان لیا کہ یہ سب دھوکا تھا، تو عوام نے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی کہ ہمیں ان مکاروں کو جلد از جلد سبق سکھانا ہے اور پھر ہوا یہ کہ پورے ملک کے عوام کے اس موڈ کے درمیان دہلی اسمبلی کے انتخابات آ گئے اور عوام کے اس موڈ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے میں کامیاب ہوگئی عام آدمی پارٹی، چنانچہ پارلیمانی انتخابات میں اس نے جس طرح نریندر مودی اور گجرات ماڈل کے خلاف منفی پروپگنڈے کا سہارا لیکر الیکشن لڑا تھا، اور نتیجۃً بری طرح ناکام رہی تھی، اس بار دہلی کے الیکشن میں اس نے اپنا طرز عمل بالکل بدل دیا، بی جے پی کے ان کو مشتعل کرنے اور غصہ دلانے اور منفی ٹریک پر کھینچ لانے کی ہزار کوششوں کے باوجود ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہوں نے اپنی توجہ بجلی، پانی، رہائشی مکانات جیسے ان مسائل ہی پر مرکوز رکھی جن سے دہلی کا عام آدمی دو چار رہتا ہے۔۔۔اور وہ اس ''عام آدمی'' کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی کہ یہ لوگ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی سے دور رہ کر ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے شخص کے بنیادی مسائل کے حل کی کوشش کریں گے۔۔۔دہلی کے عام آدمی کو ان کے پیچھے نہ تو کچھ سرمایہ دار نظر آئے اور نہ مذہبی رہنما اور نہ غنڈوں کا ٹولا، اس لیے بلا کسی فرق وامتیاز کے ہر طبقہ کے ''عام آدمی'' نے اس پارٹی کو دہلی کا اقتدار سونپ دیا۔

اس تازہ ترین صورت حال کا سب سے زیادہ اہم اور لائق توجہ پیغام یہ ہے کہ ملک کے عوام کے اصل موڈ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔شہر سے لیکر گاؤں تک اور امیر سے لیکر متوسط اور غریب طبقات تک سے تعلق رکھنے والے عوام کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ ان کے لیے اب ان منفی اور جذباتی نعروں میں کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے، یا تیزی سے کم ہو رہی ہے جو ابھی کچھ عرصے تک اپنے نیتاؤں کے ارد گرد بھولے بھالے عوام کی زبردست بھیڑ کھینچ کر لے آتے تھے۔۔۔یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بات بھی کہہ دینا مناسب

ہوتا ہے کہ ملک بہت بڑا ہے ہوسکتا ہے کہ یہ بات ملک کی راجدھانی کے بارے میں جس درجہ میں صحیح ہو، اس درجہ میں ملک کے بہت سے حلقہائے انتخاب کے بارے میں صحیح نہ ہو۔ اور وہاں ملی جلی صورت حال ہو۔۔۔تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ جذباتی اور منفی نعرے جو ماضی قریب تک ملک کے عوام کی اکثریت کو مسحور کر کے اور مصنوعی مسائل میں ان کو الجھا کر حقیقی مسائل کی طرف سے ان کی توجہ کو جس طرح ہٹا دینے میں کامیاب ہوجایا کرتے تھے اب دن بدن ان نعروں کی کشش کم ہورہی ہے۔عوام کے مزاج میں اس اہم تبدیلی کے لئے کئی اہم اسباب ہوسکتے ہیں، جن کی تفصیل میں جانے کا سرِ دست موقع نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ دہلی کے الیکشن کے نتائج نے صاف صاف یہ بتا دیا ہے کہ ملک کے عوام بی جے پی اور کانگریس کے ایک تیسرے متبادل کی تلاش میں ہیں۔اور پرانے گھسے پٹے چہروں سے تنگ آچکے ہیں۔۔ضرورت ہے کہ اس تیسرے متبادل کی تلاش اور اسے کھڑا کرنے کی جدوجہد کی جانب مسلمانوں کے اہل فکر و دانش بھی متوجہ ہوں۔۔۔اگر ایسا ہوگیا اور جو امکانات پیدا ہوگئے ہیں ان کا بھرپور فائدہ اٹھالیا گیا تو بقول حضرت مولانا ندویؒ ''ملک وملت کے حالات میں ٹھوس اور دیرپا تبدیلی لائی جاسکتی ہے''۔

اس تیسرے متبادل کی تلاش اور اس کو کھڑا کرنے کے لئے ایک راستہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ دہلی کے مسلمانوں کی طرح پورے ملک کے مسلمان بھی اروند کیجریوال اور ان کی عام آدمی پارٹی کو ہر جگہ مسند اقتدار پر بٹھانے میں اپنی پوری توانائی صرف کردیں اس طرح کہ ان کی اپنی کوئی طاقت نہ ہو-جیسا کہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلمانوں نے کیا ہے، یعنی یہ کہ نام نہاد سیکولر پارٹیوں کو مسند اقتدار پر بار بار بٹھاتے رہے-اور وہ پارٹیاں جو کچھ کرتی رہیں اس کے بارے میں اب تو کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہ بالکل عیاں ہے کہ آج ملک جس منزل تک پہنچ گیا ہے، اس تک پہنچانے میں ان نام نہاد سیکولر پارٹیوں ہی کا سب سے بڑا حصہ ہے جن کو اقتدار سونپنے میں سب سے نمایاں کردار مسلمانوں ہی کا رہا۔

تیسرے متبادل کی تلاش اور اس کو کھڑا کرنے کا دوسرا راستہ ایسا بھی اختیار کیا جاسکتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کی برابر کی شرکت ہو، یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہی دوسرا راستہ بہتر ہے۔ تاہم اس کے لیے پورے خلوص اور گہری سمجھ کے ساتھ زبردست جدوجہد کی ضرورت ہے کچھ حضرات اس کے لیے اپنی بساط کے مطابق کچھ کوششیں بھی کررہے ہیں۔

فی الحال تو راقم سطور آپ سے ان کوششوں کی کامیابی کے لیے دعاؤں کی گذارش ہی پر اکتفاء کررہا ہے۔۔ہوسکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں اس کی کچھ تفصیل بھی آپ کے سامنے رکھنے کا مرحلہ آجائے۔

محفل (۱۴۲) سورۃ الأنعام (۱)

حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

سُورَۃُ الاَنعام

(سورہ مکّیّۃ ۶، آیات ۱۶۵)

سورۂ اَنعام، قرآن کی چھٹی سورت، مکّی سورتوں میں سے ہے۔ اور اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکّی دور کی آخری سورتوں میں سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکی دور کی سورتوں کا خاص موضوع توحید، آخرت ورسالت اور بنیادی اخلاقیات رہے ہیں۔ اس سورت پر شروع سے آخر تک شرک کی نفی اور توحید وآخرت کا اِثبات اس انداز میں چھایا ہوا ہے کہ جیسے حُجّت تمام کی جارہی ہے، اور اس کے بعد دعوت وتبلیغ کا ورق اُلٹنے والا ہے۔ توحید کی حقانیت اور شرک مع اللہ کے بُطلان کے سلسلہ میں کوئی پہلو اس مبارک سورہ میں اٹھا کر نہیں رکھا گیا ہے۔ اسی ضمن میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کے اپنے بارے میں جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ آپؐ کا کلمہ پڑھنے والے اُن برادرانِ اسلام پر بھی حجت تمام کرنے اور آنکھیں کھول دینے والا ہے جو تھوڑے بہت خدائی اختیارات آپؐ کے ہاتھ میں بھی یقین کرتے ہیں۔ اور اس طرح اس میں رسالت کی حقیقت بھی عیاں ہوجاتی ہے۔

سورت کو ''الانعام'' کا نام اسی میں آئے ہوئے لفظ ''الانعام'' سے دیدیا گیا ہے۔ انعام جیسا کہ پچھلی سورتوں میں بھی یہ لفظ گزر چکا ہے، چوپایوں کو کہا جاتا ہے۔ مشرکین عرب کے یہاں شرک کی کچھ صورتیں ان کے چوپایوں سے بھی وابستہ تھیں، سورت میں کچھ آیات انہی کے حوالہ سے آئی ہیں۔ اور عبرت کا سامان ہیں کہ اگر اللہ کی دستگیری نہ ہو تو انسان (مسجودِ ملائک اور اشرف المخلوقات) کیسی شرمناک پستیوں میں خود کو اتار سکتا ہے، اور کیا ہی حق اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝

سورۂ مبارکہ کا تنبیہی آغاز

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ
ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّہِمْ یَعْدِلُوْنَ① ھُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ
قَضٰٓی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ② وَھُوَاللّٰہُ فِی
السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّکُمْ وَجَھْرَکُمْ وَیَعْلَمُ مَا
تَکْسِبُوْنَ③ وَمَا تَاْتِیْھِمْ مِّنْ اٰیَۃٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّھِمْ اِلَّا کَانُوْا عَنْھَا
مُعْرِضِیْنَ④ فَقَدْ کَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَھُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْھِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا
کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ⑤ اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ قَرْنٍ
مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَکِّنْ لَّکُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْھِمْ
مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْھٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمْ فَاَھْلَکْنٰھُمْ بِذُنُوْبِھِمْ
وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِھِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ⑥ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ کِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ
فَلَمَسُوْہُ بِاَیْدِیْھِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ⑦ وَقَالُوْا
لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ مَلَکٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَکًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ⑧
وَلَوْ جَعَلْنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلْنٰہُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَیْھِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ⑨ وَلَقَدِ
اسْتُھْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِکَ فَحَاقَ بِالَّذِیْنَ سَخِرُوْا مِنْھُمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ
یَسْتَھْزِءُوْنَ⑩ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ
الْمُکَذِّبِیْنَ⑪

ترجمہ

ہر طرح کی تعریف کا سزاوار وہ اللہ ہے، جس نے آسمان و زمین پیدا کئے اور اندھیریاں اور روشنی بنائی۔ اس پر بھی یہ کافر کچھ دوسروں کو اپنے پروردگار کا ہمسر ٹھہراتے ہیں (۱) وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے وجود بخشا پھر ایک میعاد (تمھاری زندگی کی)

ٹھہرائی۔ اور ایک میعاد اس کے یہاں اور ٹھہری ہوئی ہے۔ اور تم ہو کہ شک دکھا رہے ہو(۲) اور وہی اللہ ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، وہ جانتا ہے تمھارے ڈھکے کو اور کھلے کو اور جو کمائی تم کرتے ہو اس کو(۳)

اور کوئی بھی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں سے نہیں ان کے پاس آتی مگر وہ اس سے روگرداں ہی ہوتے ہیں(۴) سو اب جو یہ حق ان کے پاس آیا ہے انھوں نے اس کو بھی جھٹلا دیا ہے۔ اچھا تو جس بات (عذاب) کا وہ مضحکہ اڑاتے ہیں جلد ہی ان کو اس کی خبریں مل جانے کو ہیں(۵) کیا نہیں انھوں نے دیکھا کہ ان سے پہلے کی کتنی ہی ایسی قومیں ہم نے ہلاک کردی ہیں جن کو وہ قوت وشوکت ہم نے دنیا میں بخشی تھی جو اِن کو نہیں بخشی ہے۔ خوب مینہ ہم نے ان پہ برسائے اور نہریں جاری کیں جو ان کے ان کے نیچے بہتیں۔ پھر ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو ہم نے ہلاک کیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو وجود بخشا(۶) اور (اے پیمبر) ہم اگر تم پر کاغذ پہ لکھی کوئی کتاب بھی اُتار دیں اور یہ کافر لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیں، تب بھی کہیں گے کہ یہ تو بس صاف جادو ہے(۷) اور کہتے ہیں کیوں اس پر (رسول پر) نہیں کوئی فرشتہ اتارا گیا؟ تو (سنو کہ) اگر فرشتہ ہم اتار دیں تو قصہ ہی تمام ہو جائے اور پھر ذرا بھی مہلت انھیں نہ ملے(۸) اور (سنو) اگر ہم اس کو کوئی فرشتہ بناتے تو صورۃً اسے بھی آدمی ہی بناتے اور (اس طرح) اسی شبہ میں ان کو (پھر) ڈال دیتے جس میں یہ اب پڑے ہوئے ہیں(۹)

اور (یہ کوئی نئی بات اے پیمبر نہیں) تم سے پہلے بھی رسولوں کی ہنسی اُڑائی گئی ہے، تو ہنسی اُڑانے والے جس بات کی ہنسی اُڑاتے تھے انجام کار اسی نے ان کو آگھیرا(۱۰) کہو کہ ملک میں ذرا چلو پھرو اور دیکھو کیا انجام جھٹلانے والوں کا ہوا(۱۱)

الحمد للہ، ثمّ الحمد للہ، کہ قرآنِ پاک کی چھٹی سورہ ''الانعام'' میں غور وفکر کی سعادت کا موقع بھی فراہم کردیا گیا ہے، جبکہ امید نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ **فلهُ الحمدُ و لَهُ الشكر لا أُحصى ثناءً عليه**۔ یہ سورۂ مبارکہ تمام تر مضمونِ توحید وشرک اور آخرت کے گرد گھومتی اور مشرکین پر حجت تمام کرتی ہے۔ چھ مدنی سورتوں کے بعد یہ پہلی مکّی دور کی، یعنی قریشِ مکہ کے بیچ میں اترنے والی سورہ ہے۔ طرح طرح سے توحید

وآخرت کی حقانیت اور شرک کے بُطلان و بے حقیقتی کو اس میں اجاگر فرمایا گیا ہے۔آغاز ہی میں توحید کی حقانیت کی طرف لطیف اشارہ کے ساتھ شرک کی تردید میں اشاد ہوا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۔۔ تمام حمد وستائش کی حقدار وہی ایک ہستی (اللہ) ہے، جس نے آسمان وزمین کو وجود بخشا اور روشنی وتاریکی کی کیفیتیں جاری وساری کیں۔

''الحمدللہ'' اپنے وسیع معنیٰ میں

''حمد وستائش'' میں اُس کی تمام ہی صورتیں داخل ہیں جن کے ذریعہ بندہ کی طرف سے اللہ کی عظمت وکبریائی کے اقرار واعتراف کا اظہار ہوتا ہے، وہ الفاظ کی صورت میں ہو یا اعمال کی۔نماز میں ہماری زبان سے اسی کی جامع شہادت '' التحیّاتُ للہِ و الصَّلوٰت و الطّیّباتُ '' کہلوا کرادا کرائی جاتی ہے۔اوردل کی شہادت کے ساتھ اسی جامع اقرار واعتراف کا نام عبدیت اور بندگی ہے۔بالفاظِ دیگر فرمایا گیا کہ: عبدیت و بندگی صرف اسی ایک ذات کا حق ہے جس نے زمین وآسمان کی تخلیق کی اور نور وظلمت کی کیفیتیں بنائیں۔ بالفاظِ دیگر وہ عالم بنایا جس میں انسان جی سکے، یہی وہ دو چیزیں ہیں جن سے انسانی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی بہم رسانی ہے۔زمین وآسمان کی صورت میں فرش اور چھت ہی نہیں فراہم کی گئی ہے بلکہ رزق کا بندوبست بھی کردیا گیا ہے۔یہی دونوں چیزیں مخلوقات کا ذریعۂ رزق ہیں۔قرآنِ پاک میں اس کا حوالہ جگہ جگہ آتا ہے۔مثلاً سورہ البقرہ (۲/ ۲۲) ہی میں گزر چکا ہے: ''الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (جس نے زمین کو تمھارے لئے فرش بنادیا اور آسمان کو چھت ،اور آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس سے تمھارے لئے رزق نکالا زمینی پیداواروں کی صورت میں۔) اور آخر میں سورۃ النّبا میں فرمایا گیا: اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴿۷﴾ کیا ہم نے نہیں زمین کو بچھونا بنایا اور پہاڑوں کو میخیں (کہ زمین ڈانواں ڈول نہ ہو پائے) نیز وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ (سورۃ النّبا) اور لبالب بادلوں سے ڈھیروں پانی ہم نے برسایا کہ اس سے اناج، سبزیاں اور گھنے باغات اُگائیں۔

دوسری چیز اندھیرا اور اُجالا ، یہ بھی زندگی کے لئے اِس عالم کی لابدی کیفیات میں سے ہیں۔اُجالا اگر زندگی کی حرکت وحرارت کے لئے ناگزیر ہے تو اندھیرا آرام وراحت کے لئے۔اس ضرورت کا انتظام رات ودن کے نظام سے فرمایا گیا۔سورۃ النّبا ہی میں فرمایا گیا: وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ﴿۹﴾ وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ

لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ (اور نیند کو تمھاری ہم نے ذریعۂ آرام بنایا۔ اور رات کو ہم نے بنادیا ایک اوڑھنی۔ اور دن کو بنایا معاش کے لئے جہد وحرکت کا وقت۔) سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا: وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ (اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں (اپنی قدرت وحکمت کی) بنایا ہے۔ سو، رات کی نشانی ہم نے دھندلی رکھی (کہ آرام کرسکو) اور دن کی نشانی کو روشنی بخشدی تاکہ تم اپنے رب کا رزق تلاش کرو اور برسوں کا شمار اور حساب کتاب بھی (اس کے ذریعہ) جان سکو۔ ۱۷/ ۱۲)

مشرکین کا ظلم

الغرض زندگی اُسی کی دی ہوئی اور اسبابِ زندگی بلا شرکتِ غیرے اُسی کے فراہم کئے ہوئے، اور سب کو اس کا اقرار، پھر عبدیت کے خراج میں اسکے سوا کسی اور کا کیا حق؟ کسی اور کو معبود کا درجہ دینے کا کیا جواز؟ لیکن یہ سب جانتے اور مانتے ہوئے یہ کفر پہ بضد لوگ ہیں کہ کچھ دوسروں کو بھی اس حق میں شامل کرکے اس کے برابر کئے دیتے ہیں! اسی کے لئے فرمایا: ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ! سو یہ غضب نہیں تو اور کیا ہے؟ سراسر ضلالت اور ظلم نہیں تو کیا ہے؟ عدل کا لفظ جس سے آیت میں يَعْدِلُوْنَ کا صیغہ آیا ہے، عربی میں کئی معنوں کے لئے آتا ہے، ایک معنیٰ ان میں سے برابری کے ہیں اور اسی معنیٰ میں وہ آیت میں آیا ہے۔ اور ہماری زبان میں یہ بمعنیٰ انصاف بھی اسی معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔۔۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شرک کے لئے ضروری نہیں کہ دوسروں کو بالکل اللہ کے برابر مانا جائے۔ مشرکین مکہ بھی برابر ہرگز نہیں مانتے تھے، خود قرآن اس کا گواہ ہے۔ آیت مبارکہ میں بھی اللہ جل شانہٗ کا حوالہ آسمان وزمین پیدا کرنیوالے اور نور وظلمت کو وجود دینے والے کی حیثیت سے دے کر جواز راہِ تعجب فرمایا گیا کہ یہ لوگ پھر بھی دوسروں کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں! تو وہ اسی لئے کہ یہ ان کے یہاں بھی ایک مسلّمہ امر تھا کہ فاطر الارض والسمٰوات تو وہی ہے! پس یاد رہے کہ جو امور بھی مافوق الاسباب سے تعلق رکھتے ہیں، غیبی قدرت وطاقت چاہتے ہیں، صرف ان میں سے کسی ایک پر بھی کسی دوسرے کا اختیار ماننا مشرک بنادینے کو کافی ہے۔

توحید کے بعد آخرت

آگے ارشاد ہوا ہے: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ۔۔ الاٰیۃ (وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے وجود بخشا

پھر ایک مدت ٹھیرائی اور ایک مدت اس کے یہاں اور ٹھیری ہوئی ہے) یہ توحید کے بعد آخرت کا اِثبات ہے، مشرکین کو اسلام کی اس بنیادی تعلیم کو ماننے سے بھی انکار تھا، وہ اسے ایک ناممکن بات سمجھتے تھے۔ جبکہ آسمان وزمین کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ماننے کی طرح ان کو یہ بھی تسلیم تھا کہ وہ خود بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ اسی سے آخرت اور اُخروی زندگی پر استدلال کرتے ہوئے ارشاد ہو رہا ہے کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا (هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ) پھر ہر شخص کی زندگی کی ایک مدت معین کردی (ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا) جس کے اگلے سرے پر موت ہے۔ اور یہ بھی تم کو تسلیم ہے کہ ہر زندگی کے لئے ایک دن موت ہے۔ اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ ایک مدت اور ہمارے یہاں طے کی ہوئی ہے (وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ) جس کا نام قیامت ہے، جس پر تم موت کی نیند سے جگا کر اُٹھائے جاؤ گے، تو تعجب ہے کہ جس کی قدرت نے مٹی سے انسان جیسی ہستی کا روپ تمھیں دیا اس کی طرف سے اس آگاہی پر تم شک شکوک نکالتے ہو (ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ) کہ ایک دن تم موت کی نیند سے جگا کر اس کے حضور کھڑے کئے جاؤ گے! وہ جو تمھیں ایک بار نیست سے ہست کر چکا ہے اس کے لئے کیوں مشکل ہے کہ تمھیں دوبارہ زندگی دے کے کھڑا کرے؟

پھر فرمایا گیا: وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ (اور وہی اللہ ہے زمین میں بھی اور آسمانوں میں بھی، وہ علم رکھتا ہے تمھارے ڈھکے اور کھلے سب حالات کا اور خبر تمھارے سب اعمال کی) اس ارشاد میں آخرت کے ساتھ توحید کا اثبات بھی ضمناً ہو رہا ہے۔ اور آخرت کا تصور تو ہے ہی توحید کے عقیدہ پر موقوف۔ فرمایا زمین وآسمان سب میں اسی کا تختِ اُلوہیت بچھا ہوا ہے، نہ آسمان میں کسی اور معبود کی جگہ ہے نہ زمین میں تمھارے کسی سفارشی معبود کے لئے۔ وہی تنہا مالک ومعبود ساری کائنات کا ہے۔ اور تمھاری کوئی بات اور تمھارا کوئی فعل نہیں جو اس کے علم سے باہر ہو۔ تو اس کے بعد کیسے ہوسکتا ہے اور کیسے اس کے شایانِ شاں ہے کہ تمھارے عقائد واعمالِ بد پر پُرسش نہ کرے اور نیک نہادوں کو نیکیوں کا صلہ نہ بخشے؟ اس ارشاد میں تہدید اور آگاہی بھی آگئی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کے مقابلہ میں اپنے ناروا رویہ کے نتائج سے غفلت میں نہ رہیں۔ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

تکذیبِ حق کا انجام

اگلی آیات میں یہ آگاہی زیادہ ہی صاف صاف آرہی ہے۔ ارشاد ہوا ہے: وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ۝۔ کیسی ہی دل ودماغ کو اپیل کرنے والی نشانیاں ان کے رب کی طرف

سے آجائیں، وہ قرآنی آیات کی صورت میں ہوں یا کسی معجزاتی ظہور کی صورت میں، ان کافروں کے صنم آشنا و بت پرست دل و دماغ میں سنجیدہ توجہ کی گنجائش نہیں نکلتی، روگردانی کی روش ہی چلے جاتی ہے۔ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۔۔الاٰیۃ۔ پس اب یہ تکذیبِ حق (حق کو جھٹلانے) کی فردِ جرم کے مستحق ہو چکے، اور اس کے نتیجہ میں پیش آنے والی جن باتوں کی یہ ہنسی اُڑاتے ہیں وہ اب حقیقت بن کر سامنے آئی جاتی ہے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہ سورہ اُن دنوں میں نازل ہوئی ہے جب قریشِ مکہ پر تقریباً حجت تمام ہو چکی تھی، برسہا برس گزر گئے تھے، کوئی کسر حق کی تبلیغ میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور اب ضرورت کا تقاضہ تھا کہ ان کو آگاہی دی جائے کہ معاملہ کا ورق اُلٹنے جا رہا ہے۔ ان دونوں (۴۔۵) آیتوں میں گفتگو کا انداز بھی ایک دم بدل گیا ہے۔ جیسے کہ جرم اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ یہ لوگ قابلِ خطاب بھی نہیں رہ گئے۔ ان کی چارج شیٹ انھیں سنائی جا رہی ہے مگر منہ پھیر کر، بصیغۂ غائب۔ زبان کی ان اداؤں اور پوشیدہ معنویتوں کو وہ سمجھتے تھے اور قرآن میں بار بار اس کا اعادہ ہوتا آ رہا تھا مگر بے اثر۔

آگے کی آیتیں اس حقیقت کو اور بھی واضح کر رہی ہیں کہ یہ منکرین اگر اپنے رویہ سے باز نہیں آتے تو ورق اُلٹا چاہتا ہے۔ فرمایا ہے: اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ۔۔۔الاٰیۃ (کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کتنی ایسی امتوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے جبکہ اُن قوموں کو وہ قوت وشوکت ہم نے دی تھی جو اِن لوگوں کو نہیں دی ہے، بڑی فراوانی سے ان پر پانی ہم نے برسایا تھا اور نہریں ان کے نیچے جاری کی ہوئی تھیں، یعنی پھلنے پھولنے کے تمام لوازم ان کو بہتات سے مہیّا کئے گئے تھے۔ تاہم جب انھوں نے ناشکری کی راہ اپنائی، ہمارے رسولوں کو جھٹلایا اور مضحکہ بنایا، ان نعمتوں اور قوت وشوکت کو ہماری دَین سمجھنا بھول کر انھیں ہماری مرضی کی خلاف استعمال کرنے پہ کمر باندھی، تو ہم نے چشم زدن میں ان کو نمونۂ عبرت بنا دیا۔ ان قوموں میں خاص طور پر عاد وثمود کا قصہ قرآن نے اتنی بار دُھرایا ہے کہ اب نام لینے کی بھی ضرورت نہیں رہی گئی تھی۔ قومِ لوط اور آلِ فرعون کا ذکر بھی کچھ کم نہیں۔

کفار کی عجیب عجیب فرمائشیں

نہ ماننے کے سو بہانے کے طور پر نئی نئی شرطیں ماننے اور ایمان لانے کے لئے یہ مشرکین لگا

تے تھے۔مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں آتا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۸۹ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝۹۰ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝۹۱ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۝۹۲ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاۗءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ

(اور ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بڑے پُرحکمت مضامین لوگوں کے لئے دُھرائے لیکن لوگ تھے کہ عموماً انکار ہی پہ اڑے رہے ،اور کہا کئے کہ ہم تو اس وقت تک ایمان تم پر ہرگز نہ لائیں گے کہ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ تم جاری کردو، یا خود تمھارے لئے ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو جائے پھر اس کے بیچ میں جگہ جگہ نہریں دوڑاؤ، یا ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرادو جیسا کہ تم ڈرایا کرتے ہو، یا اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ، یا تمھارے لئے کوئی گھر ہی سونے کا ہو جائے ، یا تم آسمان پر چڑھ دکھاؤ ،اور ہم تمہارے چڑھ جانے کو بھی اسوقت تک نہ مانیں گے جب تک کہ ہمارے لئے تم ایک کتاب نہ اُتار لاؤ جسے ہم پڑھیں

پس ان کی ایسی ہی باتوں کے سیاق میں فرمایا جارہا ہے(وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ ۔۔۔الاٰیۃ کہ اے پیغمبر ہم اگر کاغذ پہ لکھی ہوئی کتاب بھی ان پر اُتار دیں اور یہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیں تب بھی کہیں گے یہی کہ یہ تو صاف جادو ہے۔یعنی کتابِ الٰہی کا نزول جو فرشتہ کے ذریعہ ہورہا ہے جو ان کی آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے اس کے بجائے انھیں نظر آنیوالی صورت میں وحی کا نزول ہوجائے تب بھی انھیں انکار ہی کرنا ہے جیسا کہ ان کی شرطوں پر شرطیں بتارہی ہیں۔علیٰ ھٰذا، کہا کرتے تھے کہ پیمبر پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا جو شہادت دے رہا ہوتا کہ محمد کو اللہ نے اپنی پیمبری کے لئے چنا ہے۔اس نکتہ چینی پر ارشاد ہورہا ہے کہ اگر ہم فرشتہ اتار دیتے تو قصہ ہی طے ہوجاتا۔اور ان کو جو ڈھیل ملی ہوئی ہے وہ ختم ہوکر رہ جاتی۔اس لئے کہ فرشتوں کو دیکھنے کی تاب عام انسان نہیں لاسکتا، وہ ہول طاری ہو کہ دل ٹکڑے ہوجائے۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب غارِ حراء میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے تو معلوم ہے کہ کیسی مشکل خود آپ کے لئے اس کی سہار ہوگئی تھی۔

انسانوں کیلئے فرشتہ نہیں انسان ہی رسول ہوسکتا ہے

کفر وانکار کے لئے ایک سہارا اس نکتہ کا بھی کافر لوگ لیا کرتے تھے کہ بھلا بشر اور رسالت؟ اور یہ ساری کافر برادری کا مشترکہ نکتۂ اعتراض تھا، چنانچہ ان لوگوں کی یہ ''دلیل'' بار بار دہرائے جانے کے پس منظر میں فرمایا گیا ہے :وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ (اور لوگوں کے پاس ہدایت آجانے کے بعد انھیں ایمان لانے سے روکنے والی چیز، بس ان کی یہی (سوچ) رہی کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنایا ہے!) یہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت تھی اور وہیں اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے :قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ (کہو (اے نبی) کہ زمین پر اگر فرشتے بسے ہوتے، اطمینان سے چلتے پھرتے، تو بیشک ہم آسمان سے فرشتہ ہی رسول بنا کر اتارتے۔) لیکن زمین پر تو آبادی فرشتوں کی نہیں بشر ہی کی ہے۔ زیرِ نظر آیات میں کفار کی اس عام سوچ کا حوالہ دئے بغیر اسی کے جواب کے طور پر فرمادیا گیا ہے :وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ﴿۹﴾ اگر ہم رسالت کا کام اس صورتِ حال میں کہ زمین پر آبادی انسانوں کی ہے کسی فرشتہ کو دیتے تو لازم تھا کہ آدمی ہی کی شکل اسے دیں تاکہ لوگ سہار پائیں۔ اور اس کا نتیجہ پھر ان کی اُسی سوچ کی صورت میں برآمد ہوتا کہ آدمی اور رسالت!

مقامِ عبرت

قرآن کے مطابق یہ کافروں کی سوچ تھی کہ بشر کو رسول کیسے مان لیں، رسول ہوگا تو بشر نہیں اور بشر ہوگا تو رسول نہیں۔ اور ہم حضور ﷺ کو رسول ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد اپنے درمیان پارہے ہیں جو آپ ﷺ کو بشر ماننے سے انکاری ہوکر بالکل اسی سوچ کا مظاہرہ کرنے پہ مصر ہے اور اس سوچ سے انکار کرنے والے اس کے نزدیک توہینِ رسالت کے مرتکب اور اسلئے کافر ہیں۔ کفار کے نزدیک بھی رسالت کا منصب بشریت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا تھا اور یہ برادرانِ اسلام بھی نبوت کے ساتھ بشریت کا اجتماع ناقابلِ قبول گردانتے ہیں۔ فَیالَلعجب!

رسول ہمیشہ ستائے گئے، پر انجام اُنہی کے حق میں

آگے رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لئے فرمایا جارہا ہے :وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ

سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ۔ پیمبر، پریشان نہ ہو،تم سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا تمسخر ہوا کیا ہے۔لیکن انجام انہی کے حق میں رہا،تمھاری طرح سابق رسول بھی جب اپنی امتوں کو اللہ کے غضب سے ڈراتے تو وہ بھی اسی طرح ہنسی ٹھٹے کا نشانہ بنتے تھے۔لیکن بالآخران کا ڈراوا حقیقت بنا اور دشمنانِ حق نے اس کے گھیرے میں آجانے کا مزہ چکھا۔نیز فرمایا یہ بات انھیں بھی بتاؤ(قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝)ان سے کہو کہ ملک میں ذرا چل پھر کے دیکھو کہ حق کو جھٹلانے والے کس انجام سے دوچار ہوئے۔ان کے قلعوں اور محلوں کے کھنڈرات اب بھی کہانی سنا رہے ہیں۔

اللّٰهُمَّ صلِّ عَلىٰ عَبْدِکَ وَنَبِيِّکَ سَيِّدِنا وَمَوْلٰنا محمدِ النبِيِّ الْاُمِّي وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ

☆☆☆

ایک ضروری وضاحت

گذشتہ ماہ فروری ۲۰۱۵ء کے شمارے میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ محترم مدیر الفرقان کی شب و روز کی گوناگوں مصروفیات اوران کے اسفار کی کثرت کی وجہ سے نیز ان کی گرتی صحت کے خیال سے ماہ نامہ الفرقان کی تیاری ،مضامین کی ترتیب نیز پروف ریڈنگ وغیرہ کے لئے ایک سہ رکنی ٹیم تشکیل دی گئی ہے۔

اس اطلاع سے ہمارے کچھ بزرگوں اور قدردانوں کو کافی فکروتشویش لاحق ہوگئی ،اور انہوں نے بذریعہ فون وغیرہ دریافت بھی کیا ،لہٰذا یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ ماہنامہ الفرقان محترم مدیر الفرقان ہی کی ادارت میں بدستور جاری رہے گا،اور انشاء اللہ دین اور ملت کی خدمت اسی نہج اور خطوط پر کرتا رہے گا جو اللہ کی توفیق سے اس کا امتیاز رہا ہے۔۔۔نیز جواں عمر علماء کی یہ ٹیم محترم مدیر الفرقان ہی کی نگرانی وسرپرستی میں مفوضہ کاموں کو انجام دے گی۔

ہماری گذارش پر محترم مدیر الفرقان نے یہ بھی امید دلائی ہے کہ وہ جلد ہی اپنی حالیہ اضافی اور ہنگامی مصروفیات کے بارے میں کچھ تفصیلی اطلاع اپنے قارئین کو دینے کی بھی کوشش کریں گے،اور خود قارئین کی رائے بھی طلب کریں گے۔

دعاؤں کی گذارش کے ساتھ

ناظم ادارہ

مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی
ترتیب وپیشکش: عبدالعلیم جالنوی

دورِ حاضر اور علماء کی ذمہ داریاں

[زیر نظر مضمون دراصل چند مہینے قبل محترم مدیر الفرقان کا معہد الامام ولی اللہ الادھلوی للدراسات الاسلامیہ کے طلبہ سے کیا گیا ایک خطاب ہے جس کو افادۂ عام کے لئے قدر اختصار کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے، خطاب میں موجودہ حالات کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ خدمت دین کے مختلف مراحل اور اس کی طرف عملی اقدام کے صحیح طریقوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، خطاب کا وہ حصہ بطور خاص قابل توجہ ہے جس میں اشاعت دین اور طریقۂ دعوت کو واضح کیا گیا ہے نیز اقامتِ دین کی تشریح اور اس کے ضمن میں شرعی حدود کے نفاذ کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے سمجھنا اور فکر صحیح کو اپنانا بے حد ضروری ہے ——— عبدالعلیم]

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوۡا فِى الدِّيۡنِ وَلِيُنۡذِرُوۡا قَوۡمَهُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَحۡذَرُوۡنَ ﴿التوبۃ: ۱۲۲﴾

وقال صلی اللہ علیہ وسلم: **یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ وینفون عنہ تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین:** [1]

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین

دورِ حاضر کی منفی خصوصیات

اس عنوان کے دو بڑے جز ہیں ایک ''**دورِ حاضر**'' اور دوسرا ''علماء کی ذمہ داریاں'' یہ دور دورِ نبوت

---

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، باب العلامات بین یدي الساعۃ وذکر الدجال، ج: ۱۰، ص: ۱۱۰، دار الکتب العلمیہ - بیروت۔

سے کافی فاصلے پر ہے، اور نبوت کے دور سے جب فاصلہ زیادہ ہوجاتا ہے تو قلوب میں قساوت آجاتی ہے۔ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ (ان پر ایک طویل زمانہ گذر گیا جس کے نتیجے میں ان کے دل سخت ہوگئے) (الحدید:۱۶) یہ قرآن مجید کا ایک اہم اشارہ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ انبیاءؑ کی روحانیت سے دنیا کو فیض اور تاثیر ملے ہوئے جب ایک مدت گذر جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں انسانی دلوں کے اندر ایک سختی پیدا ہوجاتی ہے، اس لیے دور حاضر کی ایک خاص بیماری ہے ''قساوت قلب'' پھر یہ دور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے کے مطابق جبابرہ کی حکومت کا دور ہے، فتنوں کا دور ہے نیز یہ میڈیا کا دور ہے، پروپیگنڈے کا دور ہے، اس وقت میڈیا کے ذریعہ پوری دنیا کے انسان مخصوص ذہنیت کی ایک خوراک روزانہ لیتے ہیں، پہلے زمانے میں بہت سے لوگ سادہ ذہن اور خالی الذہن ہوا کرتے تھے، اور شیطانی طاقت والوں کے پاس یا کذب وافترا والوں کے پاس انسانی خیالات وافکار کو بدلنے کے لیے بظاہر اتنے طاقتور وسائل نہیں ہوا کرتے تھے جتنے آج ہیں، آج انسان کو پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کی سوچ خارجی موثرات اور خارجی عوامل سے کتنی زیادہ متأثر ہورہی ہے۔ اس وقت کی جو منفی علامات ہیں یہاں ان کی طرف صرف اشارے کردیے گئے ہیں، یہ عناوین ہیں، ان عناوین سے ہمیں پڑھنے میں لکھنے میں، سوچنے میں اور آپس میں مباحثہ کرنے میں مدد ملے گی انشاء اللہ۔

عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ دورِ حاضر مشینی دور ہے، صنعتی ترقی کا دور ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے، بلا شبہ یہ پہلو بھی اس میں آئیں گے لیکن اب یہ اصل نہیں رہے، اب یہ پرانی کہانی ہوگئے، ٹرین کے بنے ہوئے کتنے سال ہوگئے؟ ہوائی جہاز کے بنے ہوئے کتنے سال ہوگئے؟ ٹیلیفون کے بنے ہوئے کتنے سال ہوگئے؟ آج کی نسلوں کے لئے یہ نئی چیز نہیں ہے، وہ تو اسی میں پیدا ہوئے ہیں، یہ جو پہلو ابھی ذکر ہوئے (منفی خصوصیات کے ضمن میں)، یہ ہیں وہ اسباب جو ذہنوں کو بری طرح متأثر کئے ہوئے ہیں اور خاص سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں، دور حاضر کی یہ کچھ موٹی موٹی چیزیں ہیں جو ہمارے سامنے آنی چاہئیں۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ہم کس زمانے میں ہیں، ان باتوں کا استحضار اگر علماء نہیں رکھیں گے تو ''کلموا لناس علی قدر عقولهم''[1] پر عمل کیسے کرسکیں گے؟ ہمارے جو سامعین یا قارئین ہوتے ہیں ان کی عقلیں دورِ حاضر کے پروپیگنڈے سے کتنی متأثر ہیں اس کا لحاظ ہمیں کرنا پڑے گا۔

دورحاضر کی مثبت علامات

---

[1] مرقاة شرح مشکوٰة، باب العلامات بين يدي الساعة و ذكر الدجال، ج:۱۰، ص:۱۱۰، دار الکتب العلمیہ - بیروت۔

اس دور کی ایک مثبت علامت یہ ہے کہ اس وقت ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو دور حاضر کے تہذیب وتمدن، معاملات اور اس کی چھوڑی ہوئی نفسیاتی کیفیات سے غیر مطمئن ہے، آج کے حکومتی نظام سے، عدالتی نظام سے، امن وقانون کی صورت حال سے، اور امن وقانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں اور ان کی کارکردگی سے، پولیس اور ان کی کارکردگیوں سے کون مطمئن نظر آتا ہے؟ ایسے لوگ تو کم نظر آتے ہیں جن پر اس کو بدل ڈالنے کی دھن سوار ہو لیکن غیر مطمئن تو سب ہی نظر آتے ہیں، اور اب ایسے لوگوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے جو تبدیلی چاہتے ہیں، اور کوئی بھی ان کو تبدیلی کے لئے آواز دیتا ہے تو وہ چلے آتے ہیں۔

ایک مثبت علامت یہ بھی ہے کہ اس دور میں مکمل اظہار خیال کی آزادی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں، یا جن کے پاس ذرائع ابلاغ ہیں وہ ہماری بات کو عوام تک پہنچانے میں ہماری پوری مدد نہیں کر رہے ہیں- اور یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ ہم بہت سے وسائل رکھتے ہوئے اپنے ذرائع ابلاغ نہیں کھڑے کر پا رہے ہیں- اس سب کے باوجود اگر کوئی شخص، کوئی امت، یا کوئی گروہ اپنی بات پیش کرنا چاہے تو سلیقہ کے ساتھ، دور حاضر کے رواجوں کا خیال کرتے ہوئے، اخبارات کے کالموں میں یا حتی المقدور دوسرے ذرائع ابلاغ کا استعمال کر کے یا کچھ دوسری تدابیر اختیار کر کے ایسا کر سکتا ہے۔ بہر حال اپنی بات کہنا دنیا کی تاریخ میں کبھی اتنا آسان نہیں ہوا جتنا اس دور میں ہوا ہے، یہ مختصراً تذکرہ ہے دور حاضر کی مثبت علامات کا۔

علماء کی ذمہ داریاں

اب آیئے علماء کی ذمہ داریوں کی طرف اس وقت دین کی خدمت کے تین بڑے میدان ہیں، حفاظتِ دین، اشاعتِ دین اور اقامتِ دین۔ حفاظت دین کے اندر پچاسوں کام آجائیں گے مثلاً ہمارے تمام بچوں، تمام مردوں اور عورتوں کے عقائد صحیح ہوں، وہ قرآن صحیح سے پڑھیں، ارکان ادا کریں، ان کے پاس ضروری علم ہو، اور پوری امت تمام گمراہیوں سے محفوظ رہے، ہمارے بچوں اور نسلوں کو صحیح تعلیم ملے اور غلط تعلیم سے وہ محفوظ ہوں، ہمارے کروڑہا کروڑ بچے جو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں پڑھتے ہیں وہاں ان کو کیا پڑھایا جا رہا ہے؟ کس قدر ان کے عقائد کو مسخ کیا جا رہا ہے؟ یہ سب حفاظتِ دین کے تقاضے ہیں اور علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان چیزوں پر نظر رکھیں، چند بچوں کو ہم مدرسے میں لے کر بیٹھ جائیں اور مطمئن ہو جائیں، اس سے مجموعی طور پر علماء کی ذمہ داری ادا نہیں ہوتی، کچھ علماء کو ضرور ان باتوں پر نظر رکھنی چاہیے،

جب ہم ان باتوں کا جائزہ لیں گے تو ہمارے ہوش اڑ جائیں گے اور ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے ستر اسی فیصد بچے شرک پڑھ رہے ہیں، ہندی دیومالائی عقائد ان کے ذہنوں میں بڑی مہارت کے ساتھ بٹھائے جارہے ہیں، کرسچین اسکولوں کے اندر ان کو عیسائیت پڑھائی جارہی ہے، وہ روزانہ SON OF GOD JESUS CHIRIST (خدا کے بیٹے عیسیٰ مسیح ہے) سے prayer (دعا) کرتے ہیں، ہمارے ہزاروں بچے اِن اسکولوں میں جاتے ہیں، علماء کے بچے جاتے ہیں، اور وہ صبح کی اسمبلی میں Jesuschrist (عیسیٰ مسیح) سے دعا مانگتے ہیں، گویا ان کی ہر صبح شرک سے شروع ہوتی ہے، ہم کو کچھ خبر ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے، اس لئے ہم حفاظت دین کی ذمہ داری صحیح طور پر نہیں ادا کر پا رہے ہیں۔ بحیثیت مجموعی علماء کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ نظر رکھیں کہ ملک کے قانون ساز ادارے کون سے قانون بنا رہے ہیں اور ان سے شریعت کے کن احکام کی خلاف ورزی پر مسلمان مجبور ہوں گے، کون کون سے بل اسمبلی میں اور کون کون سے پارلیمنٹ میں پیش کیے جارہے ہیں، کونسا قانون بننے والا ہے اور کونسا قانون بن چکا، پھر عدالتوں کے فیصلوں پر نظر رکھنے والی ایک جماعت ہونی چاہیے کہ عدالت کیا کیا فیصلے نافذ کر رہی ہے اور اس سے شریعت کے کن کن احکام پر عمل کرنا دشوار ہوسکتا ہے، نیز مختلف ممالک کے علما اپنے اپنے ملک میں یہ ذمہ داریاں کیسے پوری کر سکتے ہیں، اس کا علم اور اس کی طرف عملی اقدام بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمارے غریب لوگ جو روزگار کرنا چاہتے ہیں وہ روزگار کے لئے کن شرطوں پر قرض لینے پر مجبور ہیں اور انھیں سودی قرض لینے سے کیسے بچایا جاسکتا ہے، اس کو معلوم کرنا، نیز لوگوں کو سودی قرض لینے سے روکنے کی کوشش کے علاوہ ملک کے قانون کا لحاظ کرتے ہوئے متبادل اداروں کے قیام کی کوشش کرنا - تاکہ لوگ اسلامی طریقے پر قرض لیں - اور اس کے امکانات تلاش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے، ملک کا میڈیا اور عالمی ذرائع ابلاغ اسلام کے خلاف کیا کیا زہر اگل رہے ہیں، اس پر نظر رکھنا اور اس کو COUNTER (دفع) کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے اور یہ سب حفاظت دین کے دائرے میں آتا ہے۔ یہ دائرۂ اسلام کے باہر اور کفر کی طرف سے جو حملے ہورہے ہیں اُس کا ذکر تھا۔ ''خارجی حملے،، ایک بڑا عنوان ہے جس کے تحت بہت ساری چیزیں آجائیں گی۔

اندرونِ امت حفاظتِ دین کے کام

اور اندرون امت بھی حفاظت کے بہت سے کام ہیں مثلاً جو مختلف فرقے، گروہ یا نقطہائے نظر ومسالک ہیں ان کی طرف سے کیا اعتراضات ہورہے ہیں؟ ہمارے عوام میں کیا کیا بدعات ورسوم رائج ہیں؟ کس طرح اُن کو اُن بدعات اور رسوم سے نکالا جائے، اور دین کو تحریف سے بچایا جائے؟، یہ سب حفا

ظت دین کے تقاضے ہیں۔ جو لوگ دین کی حقیقت کو نہیں سمجھتے، وہ دین کی غلط تفہیم و تشریح کر رہے ہیں، یہی وہ جز ہے جس کو حدیث شریف میں "تأویل الجاهلین" کہا گیا ہے، اس کا دفاع کیا جائے اور بتایا جائے کہ اسلام کی تعلیم اس سلسلے میں یہ ہے، تو امت کے اندر جو مسائل ہیں ان پر بھی ہمیں کڑی نظر رکھنی پڑے گی، جو رجحانات پھیلائے جاتے ہیں، ان کو روکنے کی کوشش کرنا، مثلاً تیزی کے ساتھ یہ بات پھیلائی جارہی ہے کہ اتباعِ سلف کی کوئی ضرورت نہیں، کتاب وسنت کافی ہے اور ہماری نوجوان نسل اور نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بہت متأثر ہورہا ہے، اس دور میں اس طرح کے سب کے سب گروہ خوارج بنتے چلے جارہے ہیں، خوارج کی فکری خصوصیت تھی کہ ہمیں قرآن وحدیث کا جو حکم سمجھ میں آتا ہے بس وہ درست ہے، اور اس میں کسی سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور یہی اس دور میں ان تمام لوگوں کا حال ہے جو ہتھیار اٹھائے پھر رہے ہیں، تماشے کر رہے ہیں اور عجیب عجیب حرکتیں کر رہے ہیں، اب علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امت میں یہ غلط فہمی نہ پھیلنے دیں، اور لوگوں کو سمجھائیں، اور بہت مثبت، حکیمانہ، منطقی، معقول اور مانوس کرنے والا انداز اختیار کریں، متنفر کرنے والا انداز ختیار نہ کریں۔ اس کے علاوہ مکاتب کا قیام حفاظتِ دین کے لیے ضروری ہے اور بہت بڑا کام ہے، نیز ہر ایمان والا ارتداد سے بچے اور کم از کم اسلام کے ضروری مسائل جانے یہ بھی حفاظتِ دین کا بہت بڑا تقاضہ ہے۔

اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کے فتنوں کا مقابلہ ضروری ہے

اندرونی جو تحریفات، مغالطے اور انحرافات ہیں ان کی بھی ہم کو اصلاح کرنی ہے اور ایک توازن قائم رکھنا ہے، عموماً یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ بیرونی حملوں پر نظر رکھتے ہیں، ان کا مزاج اندرونی تحریفات کو نظر انداز کرنے کا بن جاتا ہے، ان کا مزاج یہ بنتا ہے کہ" کچھ مت بولو، بس اتحاد قائم رکھو، اگر ہم نے فکر اسلامی کے کچھ انحرافات کو بتانا شروع کیا اور امت کو بدعات سے بچانا شروع کیا تو امت اختلافات کا شکار ہوجائے گی، اور اس وقت باہر کے اختلافات سے ہم کو مقابلہ کرنا ہے" اور آج کل اس مزاج کا بہت غلبہ ہے، اگر آپ کسی کی تقریر میں ایسی باتیں سنیں گے کہ ہمیں ہر قیمت پر اتحاد قائم رکھنا چاہیے اور کسی قیمت پر ہم کو کوئی مسئلہ چھیڑنا نہیں چاہیے تو ایسا مقرر بہت مقبول ہوگا، اور کہا جائے گا کہ یہ بہت وسیع الخیال اور وسیع الفکر انسان ہے، اور دور حاضر پر اس کی نظر ہے، ٹھیک یہی غلطی دوسرے گروہ سے بھی ہورہی ہے کہ جن کی نظر اندرونی انحرافات پر زیادہ ہوتی ہے ان کی توجہ بیرونی خطرات کی طرف سے ہٹ جاتی ہے، امت میں اس کی

ہزاروں مثالیں موجود ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف ہر شہر میں دو مختلف قسم کے لوگ نظر آتے ہیں، بعض علماء پر اس کا غلبہ ہے کہ اندرونی خطرات سے امت کی حفاظت کیسے کی جائے اور وہ اس میں بڑے مخلص ہیں، جری ہیں، اور کسی قیمت پر وہ رعایت نہیں کرتے نہ بریلویت کی نہ شیعیت کی نہ فلاں کی نہ فلاں کی، ہر طرف جلسے منعقد ہوتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، جس میں اندرونی انحرافات سے امت کو بچانے کی زبردست اور مخلصانہ کوششیں ہوتی ہیں لیکن کہیں کہیں بیرونی خطرات سے مقابلے کی مصلحت مجروح ومتأثر ہوتی نظر آتی ہے، اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بہت سے وہ لوگ جو بیرونی خطرات کا شعور رکھتے ہیں اور جن پر اس بات کا غلبہ ہے کہ امت میں کسی طرح تفرقہ نہ ہونے پائے، ان پر اس قدر وہ شعور غالب آتا ہے کہ وہ تمام خرافات اور بدعات وگمراہیوں کو برداشت کرتے ہیں اور صرف برداشت نہیں کرتے بلکہ اپنے رویہ سے اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگتے ہیں، اور پھر ان دونوں میں زبردست ٹکراؤ ہوتا ہے حالانکہ وہ دونوں ہمارے ہی حلقے کے علماء ہوتے ہیں، یہ اُن کو آزاد خیال، لاپرواہ، اکابرین کے راستے سے ہٹا ہوا قرار دیتے ہیں اور وہ اِن کو دقیانوسی، تنگ نظر قرار دیتے ہیں، اور ہماری ساری توانائی اسی میں برباد ہوجاتی ہے۔ اور بہتر راستہ درمیان کا ہے کہ ہم کو بیرونی خطرات سے امت کی حفاظت بھی کرنی ہے اور اندرونی انحرافات سے امت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش بھی کرنی ہے، اور انداز ایسا اختیار کرنا ہے کہ اِس کو کرتے ہوئے اُس کے تقاضوں پر چوٹ نہ پڑے اور اُس کو کرتے ہوئے اِس کے تقاضے نظر انداز نہ ہوں۔

ہمارے اکابر علماء کا امتیاز

ہندوستان کے تجدیدی سلسلوں- وہ چاہے سلسلہء ربانی ہو یا ولی اللہی یا ان سلسلوں کے وارثین ہمارے علماءِ دیوبند- کی امتیازی شان یہ ہے کہ انہوں نے دونوں قسم کے تقاضوں پر یکساں طور پر نظر رکھی ہیں، حضرت امام شاہ ولی اللہؒ نے امت کو بدعات سے، پیرزادوں اور مجاوروں سے بچانے کی کوشش کی اور جہاں جس مسئلے کی تنقیح کی ضرورت پڑی اُس میں انہوں نے کسی سمجھوتے سے کام نہیں لیا، توحید وسنت کی تمام تفصیلات اور تمام تفریعات کو ہر موقع پر بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا، اسی کے ساتھ بیرونی فتنوں کے سلسلے میں بھی پورے چوکنا رہے اور اس سے مقابلے کی بھرپور کوشش کی، عملی جہاد کی ترغیب دی، سارا میدانِ جہاد شاہ ولی اللہؒ کا تو سجایا ہوا ہے۔

اور یہ بھی غلط فہمی نہ ہو کہ یہ بات صرف شاہ ولی اللہؒ پر ختم ہوگئی بعد میں نہیں چلی یہ ایک بہت پھیلا

ہوا خیال ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے علماء کے مزاج کے بارے میں صحیح طور پر واقف نہیں ہوئے ہیں کیوں کہ جن لوگوں کی ترجمانی سے ہم نے اپنے اکابر کا مزاج سمجھا ان پر غالب تھا اندرونی گمراہیوں سے تحفظ کا مزاج، تو انہوں نے اپنے ممدوح علماء (ہمارے اکابر) کے اسی پہلو کو زیادہ اجاگر کیا، اور کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی اور کا تعارف کراتا ہے اور دراصل وہ اس کا اپنا تعارف کر رہا ہوتا ہے ''حدیثِ نفس در حدیثِ دیگراں'' آدمی اپنے ذوق کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے اور لکھ رہا ہوتا ہے کسی اور کی سوانح یا منسوب کر رہا ہوتا ہے کسی اور کی طرف، تو یہ ولی اللہی مزاج تھا کہ دونوں متضاد تقاضوں کا لحاظ کیا جائے اور یہی بات ہمیں اکابر علمائے دیوبند میں نظر آتی ہے، حضرت نانوتویؒ کو دیکھئے کہ جب ان کو آریہ سماج کی طرف سے خطرہ محسوس ہوا اور لگا کہ اب یہ ملک برہمنی جارحیت کے نرغے میں پھنسے گا تو میدان میں اتر پڑے، اسی طرح جب ہندوستان میں عیسائیت اور صلیبیت کا حملہ ہوا اور ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں ہونے لگیں، تو اس وقت بھی حضرت نانوتویؒ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اور ہمارے دیگر اکابرِ علماء ہی عیسائیت کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے، اور میدانِ جنگ ہو یا میدانِ دعوت ہر جگہ ان فتنوں کا مقابلہ کیا، اسی طرح جب انہیں لگا کہ جدید تعلیمی نظام سے الحاد پھیلے گا تو انہوں نے اس سے بھی مسلمانوں کو بچایا اور مدارس قائم کیے۔ اور اندرونی فتنوں کے مقابلے کے سلسلے میں تو علماءِ دیوبند سے زیادہ متحرک شاید ہی کوئی ہو، اسی وجہ سے ہمارے اکابر پر اندرونی فتنوں سے حفاظت کے سلسلے میں بھی تفریط کی شکایت نہیں کی جاسکتی، بہرِ حال دونوں تقاضوں کو بہت اعتدال اور جامعیت کے ساتھ پورا کرنا ہمارے اکابر علماء کی خصوصیت ہے، اور بہت کم لوگوں کو یہ نعمت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا ذوق ومزاج کسی ایک طرف چلتا ہے اور یہ بالکل درست نفسیاتی حقیقت ہے، اللہ امت میں الگ الگ مزاج کے لوگوں کو پیدا کرتا ہے اور پھر امت کو کوئی ایسا قائد مل جاتا ہے جو ہر ایک کی صلاحیت کو اس کے میدان میں استعمال کرتا ہے اور دین کے الگ الگ تقاضوں کی تکمیل ہوجاتی ہے، کچھ تقاضوں کی تکمیل سیدنا ابوھریرہؓ کے ذریعے ہوئی اور کچھ کی حضرت خالد بن ولیدؓ کے ذریعے ہوئی، نہ ابوھریرہؓ حضرت خالدؓ کے میدان کے تھے نہ حضرت خالدؓ حضرت ابوہریرہؓ کے میدان کے تھے، اور ایک ہی آدمی کا سارے کام کرنا ضروری بھی نہیں ہے، اور ہر ایک سے اس کا مطالبہ بھی فطری نہیں ہے، ہاں انسان کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ میں فلاں میدان میں کام کرسکتا ہوں، اور دوسرے کاموں کو نہ اسے غیر اہم سمجھنا چاہیے اور نہ ان کے کرنے والوں پر

نکیر کرنی چاہیے، البتہ بحیثیت مجموعی علماء کی اتنی ذمہ داری ضرور ہے کہ وہ اس بات کا شعور رکھیں کہ ہمیں داخلی فتنوں سے بھی امت کو بچانا ہے اور خارجی فتنوں سے بھی۔ حفاظتِ دین کے متعلق یہ مختصر اشارے ہیں ورنہ سچی بات یہ ہے کہ یہ کام بہت وسیع ہے۔

اشاعتِ دین

اور اشاعتِ دین کا مطلب ہے دنیا کے تمام انسانوں تک اسلام کو پہنچانا، صرف مسلمانوں کے تمام طبقات تک صحیح دین کو پہنچانا ہی اتنا زبردست کام ہے کہ اس کے لیے کروڑوں کارکن درکار ہیں، ایک ایک فوجی، پولس، صحافی، کالج کے اساتذہ وطلبہ، کسان ومزدور اور پھر مسلمانوں سے آگے بڑھ کر پوری دنیا کی آبادی کو لیکر سوچا جائے تو اس کا دائرہ اور وسیع ہوجاتا ہے، یہ بہت بڑا کام ہے، مراحل میں تقسیم کرکے اس کو کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے جو بھی جائز ذرائع اختیار کیے جاسکتے ہوں وہ اختیار کیے جائیں تاکہ اللہ کے بندوں تک اس کا صحیح پیغام پہنچایا جاسکے۔

اس وقت عالمی حالات بھی کچھ اس طرح بن گئے ہیں کہ اشاعتِ دین کا کام آج کے ان حالات میں جتنا آسان ہے پہلے کبھی اتنا آسان نہیں ہوا، ایک تو اس لیے کہ اسلام اس وقت موضوعِ بحث بنا ہوا ہے، اور جو چیز موضوعِ بحث بنی ہوئی ہو اس میں کسی نقطۂ نظر پر بات کرنا اور لوگوں کو متوجہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

دعوت کا ایک اہم اصول

کسی بات کو موضوعِ بحث بنانا یہ دعوت کا بہت اہم اور بنیادی اصول ہے، انبیائے کرامؑ کو دین کو موضوعِ بحث بنانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی تھی اور بہت خطرات مول لینے پڑتے تھے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کو دیکھیے کہ انہوں نے دین کو موضوعِ بحث بنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، پہلے تو انتظار کیا اور ایک مدت گذر جانے کے بعد جب کوئی خاص رات آئی اور ساری قوم کسی ستارے کی پوجا کے لیے دریا کے کنارے جمع ہوئی تو ابراہیم علیہ السلام بھی وہاں پہنچے، اور گھنٹوں وہاں بیٹھے رہے، حضرت ابراہیمؑ کے وہاں جانے سے لوگ بہت خوش ہوئے ہوں گے اور ان میں خوب حضرت ابراہیمؑ اور ان کے دین وعقائد کے بارے میں چرچا ہوا ہوگا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور ان کے عقائد وخیالات ان لوگوں کے درمیان مشہور تھے۔ سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۶۰ ﴿الأنبياء﴾۔ پھر ابراہیمؑ نے ایک زبردست طریقہ سے دینِ حق کو موضوعِ بحث بنانے کی کوشش کی، اس طرح کہ جب ستارا طلوع ہوا تو آپ نے اس کی طرف نظر اٹھائی اور کہا:

"ھذا ربی" (یہی میرا رب ہے) حضرت ابراہیمؑ سے یہ بات سننے کے بعد قوم میں کہرام مچ گیا ہوگا، گویا ابراہیمؑ نے (اپنے عقائد کے بارے میں ایک زبردست سوال کھڑا کردیا اور اس کو) موضوعِ بحث بنادیا اور جب صبح ہوئی اور وہ ستارا غائب ہوا تو اپنے کلام کا دوسرا حصہ پیش کیا کہ "لا احب الأفلین" (مجھے غائب ہونے والے تو پسند نہیں) پھر انتظار کیا (اور نہ جانے کتنے مہینے انتظار کیا ہوگا) اور جب ''چندر مادیوتا'' (چاند) کی پوجا کا وقت آیا تو پھر ان کے ساتھ (عیدگاہ) پہنچ گئے اور ایک خاص موقع پر چاند کو دیکھ کر کہا ھذا ربی (یہ ہے میرا پروردگار) اسی طرح سورج کی پوجا کے موقع پر کہا: "ھذا ربی ھذا أکبر" (یہی میرا رب ہے کیوں کہ یہ سب سے بڑا ہے) اور جب سورج غروب ہوا (اور تینوں واقعات کے نتیجے میں ان کے دین اور عقیدے کے بارے میں لوگوں میں بڑے پیمانے پر بحث ہونے لگی) تو صاف صاف پوری بات کہہ دی: یٰقوم انی بریئ مما تشرکون (اے میری قوم جن چیزوں کو تم اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہو میں ان سے بیزار ہوں)

پھر اسی مقصد (دین کو موضوع بحث بنانے) کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ایک اور طریقہ اپنایا اور وہ یہ کہ عید کے موقع پر جب لوگ عیدگاہ گئے تو بتوں کی گردن ماری اور کلہاڑی بڑے بُت کے گلے میں ڈال دی۔ جب قوم عیدگاہ سے واپس آئی اور اپنے بتکدے کا برا حال دیکھا اور بحث وتفتیش کے بعد جب ابراہیمؑ گرفتار کرکے لائے گئے اور ان سے پوچھا گیا تو فرمایا: ان ہی سے پوچھو وہ خود بتائیں گے، لوگوں نے یہ منہ توڑ جواب سنا تو یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ بولتے نہیں! یہاں ابراہیمؑ کو موقع مل گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ جب یہ بولتے اور سنتے نہیں تو ان کی پوجا کیوں کرتے ہوں؟ الغرض دین کو موضوعِ بحث بنانے کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے اتنا سب کیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف تماشہ نہیں تھا، امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں (ان آیتوں کی) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کا حکیمانہ طریقۂ دعوت تھا، انہوں نے اس طریقہ کو طریقۂ استدراج کہا ہے[1] کیونکہ آپ علیہ السلام نے لوگوں کو ایک حقیقت کی طرف لے جانے کا تدریجی راستہ اختیار کیا، ایک دم سے توحید کا اعلان نہیں کیا۔

اشاعتِ دین کی مختلف صورتیں

ہر ملک اور علاقے کی صورتِ حال الگ ہے، ہم اپنے ملک کی بات کرتے ہیں، (اشاعتِ دین کے لیے) ہم مختلف انداز سے غیر مسلموں کو ہمارے یہاں (گھر وغیرہ پر) چائے ناشتے یا کھانے پر بلا کر ان

---

[1] تفسیر کبیر، امام رازیؒ، ج:۷، ص:۱۴۱، ۱۴۲۵ھ (۲۰۰۴ء)، دار الکتب العلمیہ - بیروت۔

کو اپنے اخلاق واعمال سے اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں۔ اور وہ لوگ اس کو برا نہیں سمجھتے بلکہ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ، اور خاص طور پر ان کے پڑھے لکھے لوگ اسلام کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، اسی طرح اسپتالوں میں، جیلوں میں خدمت کرکے، غریبوں کا علاج کراکے، اور دوسرے طریقوں سے بھی انہیں مانوس کرکے ان کے سامنے اسلام کا تعارف کرسکتے ہیں۔ آگے کی سطح پر سوچئے تو اسکولوں، کالجوں، یونیورسیٹیوں وغیرہ سے رابطے بڑھادیے جائیں اور کوئی تنظیم یا شخصیت جو انتظامیہ سے مانوس ہو ان سے کہے کہ ہم طلبہ وطالبات کے سامنے اسلام کا تعارف کرانا چاہتے ہیں، آپ ہمیں ادارے میں اس کا موقع دیجیے، تو آپ دیکھیں گے کہ تعصب کے اس دور میں بھی سینکڑوں اداروں کے ذمہ داران اس پر راضی ہوجاتے ہیں، ہمیں یہ مواقع حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یہ الگ بات ہے کہ ایسے اداروں میں کچھ جارحیت پسند لوگ بھی ہوں گے اور وہ ہم سے الجھیں گے، جارحانہ سوالات کریں گے، ہمیں ان مسائل کے مقابلے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے، اور بہت ہی ہمت، حکمت اور بشاشت کے ساتھ ان کے سوالات کو Appreciate (سراہتے ہوئے) کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنی بات کو رکھنا چاہیے، اس زمانے میں دعوت دینے والوں کو کون پتھر مارتا ہے، اب تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ عزت کے ساتھ بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں، ہمیں بتایئے ہم نے ایسی باتیں کہیں نہیں سنیں، اور اگر کوئی ایسی (ستانے یا پتھر مارنے والی) بات ہمارے ساتھ ہو بھی گئی تو انشاءاللہ وہ ہماری مغفرت کا سامان بنے گی۔ اشاعتِ دین کا میدان بھی بہت وسیع ہے اور علماء کی ایک بڑی تعداد اس کے لیے بھی درکار ہے۔

اقامتِ دین

حفاظت اور اشاعت کے بعد مرحلہ آتا ہے اقامتِ دین کا، یہ بھی ہمارا فرض اور ہماری ذمہ داری ہے، (عام طور پر) جب اقامتِ دین کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے حکومت واقتدار پر قبضہ مراد لیا جاتا ہے، حالانکہ قرآن میں "اقیموا الدین" کا لفظ اس مفہوم میں نہیں آیا ہے، اس لیے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقامتِ دین کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے ہاتھ میں حکومت آجائے اور ہم ہی لوگوں کو انصاف دلائیں یہ اسلام کی صحیح ترجمانی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ کوشش کریں کہ نظامِ حکومت عادلانہ ہوجائے، (ہاں البتہ ہماری مخلصانہ تمنا یہ ہونی چاہیے کہ چونکہ اسلام پوری انسانیت کی فلاح وبہبود کا نسخہ کیمیاء لے کر آیا ہے اس لیے اہلِ اقتدار اس کے عدل وانصاف اور امن پر مبنی نظامِ حیات پر غور

کریں اور اس کو سمجھ کر اپنے ملک میں نافذ کرنے کی کوشش کریں تا کہ کمزوروں کو ان کے حقوق ملیں، لوگ غربت، جہالت اور بدامنی سے نکلیں۔) خلاصہ یہ کہ ہماری یہ تمنا نہیں ہونی چاہیے کہ حکومت ہمارے ہاتھ میں ہو بلکہ یہ ہونی چاہیے کہ نظامِ حکومت عادلانہ ہو۔ ان دونوں Approaches (طریقۂ فکر میں) میں بہت فرق ہے۔ یہ (اقامتِ دین والی) اصطلاح اس دور میں اس طرح استعمال کی جارہی ہے کہ اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس کا وہی مروج غلط مفہوم مراد نہ لیا جائے اور اسی وجہ سے اس کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔

ہر ملک میں اقامتِ دین کے مراحل الگ الگ ہو سکتے ہیں

ہر ملک کے علماء کا فرض ہے کہ وہ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کریں کہ ہمارے ملک میں اقامتِ دین کی ابتداء کس مرحلے سے ہونی چاہیے، عام طور پر مسلم ممالک میں اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں سے یہ غلطی ہو رہی ہے کہ وہ اقامتِ دین کی ابتداء حدود کے نفاذ سے کرنا چاہتے ہیں اور اپنی حکومتوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ''وہ ساری شرعی حدود نافذ کریں'' یہ بالکل غلط طریقہ ہے، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارا معاشرہ کس سطح پر ہے، اور اس وقت ہمیں کس تدریجی ترتیب کے ساتھ الاہم فالاہم کا لحاظ کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے، معاشرے میں عریانیت پھیلی ہوئی ہو، مخلوط تعلیم ہو، ہر دفتر میں مرد اور عورتیں شانہ بشانہ کام کر رہے ہوں، عریاں فلمیں ہر طرف چل رہی ہوں، ٹی وی اور اخبار وغیرہ کے ذریعے ہر وقت عریانیت پھیلائی جارہی ہو، مختلف ذرائع سے جنسی جذبات میں ہیجان بپا کیا جارہا ہو، زنا کو نہایت آسان اور نکاح کو مشکل تر بنا دیا گیا ہو، تو ہمیں غور کرنا ہوگا کہ کیا ایسی صورت میں شریعت حدود کے نفاذ کا مطالبہ کرتی ہے؟ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں جس سال قحط عام ہو گیا تھا (اُس سال) قطعِ ید کی حد کو موقوف کر دیا تھا،[1] اور حکم دے دیا تھا کہ کسی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، لأن الحدود تدرء بالشبهات، ہو سکتا ہے چوری کرنے والے کے گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہ ہو اور اس نے ضرورت کی وجہ سے چوری کی ہو، اس شبہ کی وجہ سے اس سال قطعِ ید کو موقوف رکھا گیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس سماج میں جرائم کے ہزاروں عوامل موجود ہوں وہاں حدود نافذ کرنے سے پہلے عوامل کو دور کرنا چاہیے، ورنہ یہ ایسا ہوگا کہ آپ نے کسی

---

[1] اعلام الموقعین، ابن القیم الجوزیؒ، فصل: من اسباب سقوط الحد عام المجاعة، ج: ۴، ص: ۳۵۰، ۱۴۲۳ھ، دار ابن الجوزیؒ، المملكة العربیه السعودیه۔

آدمی کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا اور اس سے کہا: ایاک ایاک ان تبتل بالماء، کہ خبردار پانی میں مت بھیگنا، (ظاہر ہے کہ یہ اس بیچارے کے بس سے باہر ہے) اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ دین کے کاموں کے لیے اور خاص طور پر اقامتِ دین کے لیے گہرے تفقہ فی الدین کی ضرورت ہے۔

اپنے آپ کو اللہ کے لیے وقف کرنے کی ضرورت ہے

اصل دار و مدار اس پر ہے کہ کتنا سچا ارادہ ہم اپنی زندگی کو وقف کرنے کا کر پاتے ہیں، یہ اپنے اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے، کسی کے سامنے اظہار ہو یا نہ ہو، ہمیں اللہ سے عہد کرنا چاہیے کہ اے اللہ میں آپ کے بھروسہ پر اپنے آپ کو وقف کرتا ہوں، اور اے اللہ آپ کافروں کو بھی روزی دیتے ہیں، دشمنوں کو بھی روزی دیتے ہیں، کیا میں آپ سے یہ بدگمانی کروں کہ جو آپ پر مرمٹے گا، آپ اسے بھوکا رکھیں گے، جو آپ کے محبوب کے دین کے لئے اپنے آپ کو وقف کرے گا آپ اسے بے سہارا چھوڑ دیں گے؟ اے اللہ اس قسم کی بدگمانی اور وسوسہ بھی میرے دل میں نہ آئے، پھر دیکھئے اللہ تعالیٰ کیسی بابرکت شخصیت آپ کو بناتا ہے۔

یہ وقت ہے نیت کرنے کا، یہ وقت ہے اللہ سے چپکے چپکے معاہدہ کرنے کا، آج تک کوئی انسان جس نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے وقف کیا ہو ایسا نہیں ہے کہ اس کو ایک لمحے کے لئے بھی اللہ نے بے سہارا چھوڑ دیا ہو، اللہ نے اس کو چمکا دیا اور اس کے ذریعہ سے سیکڑوں کو روزی دی، اور یہ بالکل سچی بات ہے، اس میں ادنی درجہ کا مبالغہ نہیں ہے، جس لمحہ انسان اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کرتا ہے اس لمحہ اللہ اس کے لئے نہ جانے کیا کیا فیصلے کر دیتے ہیں۔

جس وقت فوج میں بھگدڑ مچی ہو اس وقت فوج میں جو سپاہی ڈٹا رہتا ہے تو اسے کیا تمغہ ملتا ہے! اس وقت بالکل یہی حالت ہے کہ خال خال چند مجاہدین ہوں گے جو اسلام کے وفادار ہیں۔ باقی سب بھگدڑ مچائے ہوئے ہیں، اپنی تمام شرطیں محفوظ رکھ کر اور عیش و آرام کے انتظام کے بعد اسلام کی خدمت کر کے اسلام پر احسان جتلانے کی ہماری عادت بنتی جارہی ہے، اللہ ہم سب کو معاف فرمائیں، ہمیں جانباز بنائیں اور حفاظت، اشاعت اور اقامت کی استعداد ہمارے اندر پیدا فرمائیں، اور اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ ایک جم غفیر کھڑا کر دیں جو تن من دھن کی بازی لگادے۔

آمین یارب العالمین

☆☆☆

مولانا محمد اکرم کرنولی قاسمی

''اجتہاد''

ضرورت، اہلیت اور دائرۂ کار

[زیر نظر تحریر ایک اہم علمی موضوع پر لکھا گیا مضمون ہے، اجتہاد کے سلسلے میں مسلمانوں کا ایک طبقہ افراط کا اور دوسرا تفریط کا شکار ہے، درمیان کی راہ وہ ہے جو اس مضمون میں دلائل سے مبرھن کر کے پیش کی گئی ہے، جس کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے مگر اس کے لئے غیر معمولی اہلیت ولیاقت کی ضرورت ہے، لیاقت سے محروم افراد (جو قرآن کا ترجمہ اور احادیث کی شروحات پڑھ کر مجتہد بننے کی کوشش کرتے ہیں) کو اجتہاد کی اجازت دینا دین میں تحریف کا دروازہ کھولنا ہے۔ اجتہاد کے دائرے کار کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی مفید اور اہم ہے۔۔۔ محمد عمرین محفوظ رحمانی]

انسانی زندگی کی صلاح وفلاح کے لیے آسمانی رہنمائی کی ضرورت

آج کل ایسا سمجھا جاتا ہے کہ انسانی سوسائٹی کو اپنے لیے نظامِ زندگی تشکیل دینے، اپنا بُرا بھلا سمجھنے اور طے کرنے کے سلسلے میں آسمانی تعلیم اور رہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب وہ بالغ اور سمجھ دار ہوگئی ہے، اُس نے زندگی کے ہر پہلو پر آخری درجے کی تحقیق وریسرچ کر لی ہے، اُس نے تمدن کو اُس کے بامِ عروج پر پہونچا دیا ہے، اس لیے کس طرح اُسے جینا ہے اور معاشرے وسوسائٹی کے لیے کس طرح کا نظامِ حیات بنانا ہے؟ اِس کے فیصلے اب خود اُس کے اپنے ہاتھ میں ہیں، سوسائٹی کی اکثریت جو صحیح سمجھے اور انسانوں کی اجتماعی عقل جو مناسب سمجھے، بس وہی حرفِ آخر ہے، اب کسی آسمانی تعلیم کی نگرانی کی اُسے چنداں ضرورت نہیں ہے۔

یہ سوچ بظاہر بڑی پُر از اعتماد اور خوش نما ہے، لیکن ذرا گہرائی اور سنجیدگی سے سوچیں تو یہ غیر معتدل، نامعقول اور غیر فطری ہے؛ کیوں کہ انسانوں کے اندر اپنی بہت سی کمیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے یہ قابلیت نہیں ہے کہ وہ ہر دور اور ہر علاقے کے سارے انسانوں کے انفرادی واجتماعی اور مادی وروحانی تمام مصالح کی، پورے اعتدال اور جامعیت کے ساتھ رعایت کرتے ہوئے کوئی نظامِ حیات تشکیل دے سکیں۔ (چنانچہ دنیا کو بار بار اِس

استاذ معہد الامام ولی اللہ الدہلوی

کا تجربہ ہو چکا ہے۔) انسان کا علم محدود، اُس کا تجربہ ناقص، اُس کی عقل بار بار خطا کرنے والی، اُس کا نفس حیوانی خواہشات کا خوگر، وہ طبعی طور پر اپنی نسل، قوم اور ملک والوں سے ایسا خاص تعلق رکھنے والا کہ بہت سے مواقع پر اُن کی بے جا حمایت وطرف داری تک کرنے اور اُن کے مفادات کو مفادِ عامہ پر ترجیح دینے کے لیے تیار!

الغرض! اِس طرح کی بہت سی خامیاں ہیں جن کے پیشِ نظر معقول بات یہ ہے کہ انفرادی واجتماعی زندگی کے اصول وضوابط طے کر کے ایک مکمل ضابطۂ حیات کی تشکیل کے سلسلے میں انسانوں کو اُس خالقِ کائنات اور رب العالمین کی رہنمائی کی شدید ضرورت ہے جس نے کائنات کے ذرے ذرے کو اور خود انسان کی فطرت کو بنایا ہے۔

- فطرتِ انسانی کی باریکیوں کو، انسان کے دل میں اُمنڈنے والے جذبات واحساسات اور اُن پر مرتب ہونے والے اچھے برے نتائج کو، اُس کے اقوال وافعال اور کردار وگفتار کے زندگی اور سماج پر پڑنے والے مفید یا مضر اثرات کو، اُس کے جی کی تمام چاہتوں اور اُن کے مثبت اور منفی اثرات کو، اُس کی ظاہری وباطنی اور انفرادی واجتماعی ہر قسم کی ضرورتوں کو، اشیائے کائنات کی واقعی نافعیت اور مضرت کو جس سے بہتر کوئی اور نہیں جان سکتا!
- پھر نہ صرف یہ کہ اُس کا علم اِس طرح محیط ہے، بل کہ وہ اپنے بندوں پر بے حد مہربان، نہایت رحم والا، اُن سے بہت پیار کرنے اور اُن کا ہر طرح سے بھلا چاہنے والا اُن کا شفیق پروردگار ہے۔
- مزید برآں، اُس کو کسی چیز کی کوئی ضرورت اور حاجت بھی نہیں ہے، وہ بالکل غنی اور بے نیاز ہے، لہٰذا اُس کے دیے ہوئے کسی حکم میں، اُس کے اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل مقصود ہو، اِس کا بھی امکان نہیں ہے۔
- اِسی طرح اُس کا کسی انسانی گروہ سے (سوائے خالقیت، ربانیت اور مالکیت کے) نسلی، یا قومی، یا لونی، یا لسانی، یا جغرافیائی کسی قسم کا کوئی رشتہ نہیں ہے کہ جانب داری، طرف داری اور ظلم وناانصافی کا، کسی درجے میں بھی اُس سے صدور ہو سکے۔

اِن سب باتوں کی وجہ سے اُسی کو بجا طور پر یہ حق پہونچتا ہے کہ وہی اپنے بندوں کی صلاح وفلاح کو مدِ نظر رکھ کر، اُن کی مصلحتوں کی بھرپور رعایت کرتے ہوئے، اُن کے لیے اُن کی فطرت سے سو فی صد ہم آہنگ نظامِ حیات طے کرے! اور دنیا کے سارے انسان اپنے اُس شفیق رب کی پیار بھری رہنمائی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کی دی ہوئی تعلیمات کی روشنی میں زندگی بسر کریں۔

آسمانی رہنمائی اور سلسلۂ پیمبری

اِسی لیے اُس مہربان رب نے اپنی ربوبیت کے تقاضے کے تحت انسانوں کو معتدل اور فطری طریقۂ زندگی کی رہنمائی کرنے کے لیے اِس دنیا میں نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ جاری کیا اور اپنے بہت سے ہدایت نامے

بھی اُن کے ساتھ بھیجے۔ یہ سلسلہ انسانی تاریخ کے ایک لمبے عرصے تک (جو کہ ہزاروں سال پر محیط ہے) مختلف زمانی اور مکانی حدود کے اندر چلتا رہا تا آں کہ اُس علیم وحکیم پروردگار کے علم کے مطابق جب انسانیت اپنے شعور کی پختگی کے لحاظ سے ایک عالمگیر اور ابدی نظامِ حیات کو قبول کر سکنے کے قابل ہوگئی، تو اُس نے "محمد عربی" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سلسلۂ نبوت ورسالت کی آخری کڑی کے طور پر اور "قرآن" کو آخری ہدایت نامے کے طور پر بھیج کر یہ اعلان کر دیا کہ اب دین کی تکمیل ہو چکی ہے، اور اب دنیا کے اختتام تک "محمد رسول اللہ" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور "قرآنِ مجید" ہی ساری انسانیت کے لیے، معتدل اور فطری طریقۂ زندگی کے حوالے سے، آسمانی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔

تغیر پذیر حالات اور مسلسل ارتقا پذیر تمدن

لیکن یہ بھی ایک بدیہی اور نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ زمانہ اور وقت ایک حال اور ایک کیفیت پر ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھ رہا اور مختلف کروٹیں لے رہا ہے، لگا تار کسی انقطاع کے بغیر حالات بھی بدلتے چلے جا رہے ہیں۔ سوسائٹی اور تمدن روزِ اول سے مسلسل تغیر اور ارتقا کے مراحل طے کرتے ہی جا رہے ہیں۔ احوال وظروف کی بوقلمونی اور اُن میں رونما ہونے والی تبدیلیاں انسانی زندگی کا جز لاینفک ہیں۔ ایسے میں منطقی طور پر یہ بات قابلِ غور بن جاتی ہے کہ سلسلۂ نبوت ورسالت کے منتہی ومکمل ہوجانے کے بعد، لگا تار تغیر وارتقا پذیر حالات میں، نِت نئے مسائل کے پیش آنے کی صورت میں، اب انسانیت کے لیے آسمانی تعلیم ورہنمائی کا نظام کیا ہے؟

کیوں کہ اگر چہ چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی "قرآنِ مجید" اور "محمد رسول اللہ" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی بلا کم وکاست اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ محفوظ ہے، اور ساری دنیا میں اُن کو سیکھنے سکھانے، پڑھنے پڑھانے اور اُن کو پھیلانے کا کام بھی مختلف سطح پر جاری وساری ہے، مگر اِس سب کے باوجود کون نہیں جانتا کہ دنیا کے اختتام تک انسانیت کو جتنے بے شمار حالات ومسائل پیش آنے ہیں، اُن سب کی تمام تر جزئیاتی تفصیلات "قرآن وسنت" میں نہ درج ہیں اور نہ ہوسکتی ہیں! تو اب آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد، بعد کے ادوار میں پیش آنے والے لاتعداد حالات وواقعات اور مسائل ومشکلات کے، وحی ورسالت اور آسمانی تعلیم کی رہنمائی وروشنی میں حل کی کیا صورت ہے؟ دنیا کے اختتام تک "محمد رسول اللہ" اور "قرآنِ مجید" ساری انسانیت کے لیے، معتدل اور فطری طریقۂ زندگی کے حوالے سے، آسمانی رہنمائی کا فریضہ کس طرح انجام دیتے رہیں گے؟

اجتہاد

اِسی گتھی کا حل اور اِسی منزل کا راستہ ہے "اجتہاد"۔ اسلام نے نت نئے پیش آنے والے ایسے مسائل کے بارے میں، جن کے سلسلے میں کتاب وسنت میں کوئی واضح ہدایت اور رہنمائی نہ مِل سکے، شریعت کی رہنمائی دریافت کرنے کے لیے یہ نظام بنایا ہے کہ ہر دور میں قرآن وسنت کے علوم کی گہری واقفیت رکھنے والے، اسلامی تعلیمات کی روح اور منشا کو گہرائی اور اعتدال کے ساتھ سمجھنے والے، مخلص اور پرہیزگار اہل علم وماہرینِ شریعت، اپنی پوری محنت اور مکمل جدوجہد کے ذریعے، قرآن وسنت کی اصولی رہنمائیوں کی روشنی میں اور دین کے مسلمات کے دائرے کے پابند رہتے ہوئے، اُس نئی پیش آمدہ صورتِ حال کا شرعی حکم دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ اور اِسی کوشش کا نام ہے "اجتہاد"۔

"اجتہاد" کے بارے میں ایک غیر حقیقت پسندانہ سوچ

اب "اجتہاد" کے سلسلے میں ایک نقطۂ نظر امت میں یہ رہا ہے کہ آدمی کو بس قرآن وسنت کی پیروی کرنی چاہیے اور شرعی احکام کے بارے میں اپنی رائے اور اجتہاد کو دخیل نہیں بنانا چاہیے!

ہم نے ابھی اوپر کی سطروں میں جس انداز سے "اجتہاد" کی ضرورت کو واضح کیا ہے، اُس کی بناء پر ہمارے نزدیک یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ مزید یہ کہ یہ رائے غلط فہمی اور اسلامی تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ غلط فہمی اِس معنیٰ کر کہ اِس موقف میں اجتہاد کے ذریعے دریافت کردہ حکمِ شرعی پر عمل کرنے کو قرآن و سنت کی پیروی کے خلاف سمجھ لیا گیا ہے، جو سراسر غلط اور اجتہاد کا مفہوم صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ "اجتہاد" کی تو حقیقت ہی یہ ہے کہ "اپنی پوری محنت اور مکمل جدوجہد کے ذریعے، شریعت کے فروعی احکام کو قرآن وسنت کی روشنی میں جانا اور دریافت کیا جائے، نہ کہ اُن سے آزاد ہو کر محض اپنی عقل اور تجربہ سے۔" اس لیے یہ سمجھنا کہ اجتہاد کے ذریعے دریافت کردہ حکمِ شرعی پر عمل، یہ قرآن وسنت کی پیروی کے خلاف ہے، سراسر ناسمجھی ہے۔

نیز عہدِ رسالت کی تاریخ بھی اِس فکر کو مسترد کرتی ہے۔ اُس دور کے حالات وواقعات کے مطالعے سے تو بڑی قوت کے ساتھ یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں متعدد صحابۂ کرام نے کسی حکمِ شرعی کو دریافت کرنے کے لیے اجتہاد سے کام لیا اور حضور ﷺ نے اُن کے اِس طرزِ عمل کی تغلیط نہیں فرمائی، ہاں غلطی ہو جانے پر اصلاح تو فرمائی، لیکن اجتہاد سے کام لینے کو غلط نہیں قرار دیا، بل کہ اِس کے برعکس آپ ﷺ نے تحسین فرمائی۔ چنانچہ اِس سلسلے میں صحابیِ رسول حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے "یمن" روانگی کا مشہور واقعہ اِس بات کی کافی دلیل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اجتہاد کی اجازت اور پسندیدگی کا اظہار

بہت مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو (جو خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ جوہر شناس میں بھی دین کی گہری سمجھ رکھنے کے اعتبار سے صحابۂ کرام میں ممتاز اور نمایاں مقام و مرتبے کے حامل تھے) یمن بھیجتے ہوئے یہ پوچھا کہ: معاذ! اگر تمھارے سامنے کوئی مقدمہ آئے تو فیصلہ کس طرح کروگے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: اللہ کی کتاب کے ذریعے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ: اگر تم اللہ کی کتاب میں نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: تو پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے ذریعے کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ: اگر تم اُس میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: پھر تو میں کسی قسم کی کوتاہی کیے بغیر اپنی عقل سے خوب غور و فکر کروں گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سینے پر تھپکتے ہوئے فرمایا کہ: اللہ کا شکر ہے، جس نے اپنے رسول کے فرستادے اور نمائندے کو اُس بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی اور خوش ہے۔ [1]

---

[1] اِس واقعہ کی سند میں بعض لوگوں کو کلام ہے، ہم یہاں اہلِ علم کے ذوق کی تسکین کے لیے، اِس سلسلے میں امت کے مایۂ ناز محقق حافظ ابن القیمؒ کی طرف سے کیا گیا تبصرہ، اُن کی شہرۂ آفاق کتاب "اِعلام الموقعین" سے بجنسہ درج کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سند کے ساتھ اِس واقعے کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"فهذا حديث و ان كان عن غير مسمين، فهم اصحاب معاذ، فلا يضره ذالک؛ لانه يدل علىٰ شهرة الحديث، و ان الذى حدث به الحارث بن عمرو عن جماعة من اصحاب معاذ، لا واحد منهم، و هذا ابلغ فى الشهرة من ان يكون عن واحد منهم لو سمى، كيف؟ و شهرة اصحاب معاذ بالعلم و الدين و الفضل و الصدق بالمحل الذى لايخفىٰ! و لا يعرف فى اصحابه متهم، و لا كذاب و لا مجروح، بل اصحابه من افاضل المسلمين و خيارهم، لايشك اهل العلم بالنقل فى ذالک، كيف؟ و شعبة حامل لواء هذا الحديث! و قد قال بعض ائمة الحديث: اذا رايت شعبة فى اسناد حديث فاشدد يديک به! قال ابو بكر الخطيب: "و قد قيل: ان عبادة بن نسى رواه عن عبد الرحمان بن غنم عن معاذ، و هذا اسناد متصل، و رجاله معروفون بالثقة، علىٰ ان اهل العلم قد نقلوه و احتجوا به، فوقفنا بذالک علىٰ صحته عندهم، كما وقفنا علىٰ صحة قول رسول الله: "لا وصية لوارث" و قوله فى البحر: "هو الطهور ماءه الحل ميتته" و قوله: "اذا اختلف المتبايعان فى الثمن، و السلعة قائمة، تحالفا و ترادا البيع!" و قوله: "الدية على العاقلة" ـــــ و ان كانت هذه الاحاديث لم تثبت من جهة الاسناد، لكن لما تلقتها الكافة عن الكافة غنوا بصحتها عندهم عن طلب الاسناد لها، فكذالک حديث معاذ لما احتجوا به جميعاً غنوا عن طلب الاسناد له" انتهى كلام الخطيب. (انتهى كلام ابن القيم)

اعلام الموقعين ۲/ ۳۵۴، دار ابن الجوزى للنشر و التوزيع، المملكة العربية السعودية.

یہ واقعہ اِس کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ کسی بھی پیش آمدہ صورتِ حال کے سلسلے میں قرآن وسنت میں رہنمائی نہ مل پانے کی صورت میں اجتہاد کرنے کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اجازت دی ہے، بل کہ اسی کو اپنی منشاء اور مرضی قرار دیا ہے، اور اِس پر خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔

"اجتہاد" کے بارے میں ایک اور غیر معتدل رویہ

"اجتہاد" کے حوالے سے، ماقبل میں ذکر کردہ غیر حقیقت پسندانہ سوچ کے بالکل برعکس، امت میں آج کل ایک اور غیر معتدل رویہ پایا جارہا ہے۔ وہ یہ کہ آج ہر کوئی ترجمے والا قرآنِ مجید پڑھ کر اور اردو اور انگریزی ترجموں کی مدد سے بعض حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرکے اپنے لیے "اجتہاد" کا حق مانگ رہا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ اُس میں "اجتہاد" کے لیے درکار اہلیت ہے بھی یا نہیں۔

گزشتہ صفحات میں "اجتہاد" کی جو حقیقت بتائی گئی ہے، اُس کے پیشِ نظر بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ "اجتہاد" اہم اور ناگزیر ہونے کے ساتھ ساتھ کتنا دقت طلب اور نازک کام ہے؟ ہر کس وناکس کو یہ ذمہ داری کیسے سونپی جاسکتی ہے؟ اِس طرح سے تو "شریعت" بازیچۂ اطفال بن جائے گی! اِسی لیے اہلِ علم اور ماہرین شریعت نے "اجتہاد" کی اہلیت کے معیار کے طور پر کچھ اوصاف کا تعین کیا ہے، تاکہ جو بھی اِس ذمہ داری کو اُٹھانے کی سوچے تو پہلے وہ آخرت میں جواب دہی کے احساس کے ساتھ اپنے بارے میں منصفانہ غور کرلے کہ وہ اُن اوصاف کا حامل ہے بھی یا نہیں؟ اور اُس میں "اجتہاد" کے لیے درکار اہلیت ہے بھی یا نہیں؟ ہم یہاں اُن میں سے کچھ بہت ہی ضروری چیزیں ذکر کرتے ہیں:

"اجتہاد" کی اہلیت کے لیے درکار اوصاف

کسی صاحب علم میں "اجتہاد" کی اہلیت کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم اِن اوصاف کا حامل ہو:

عربی زبان پر عبور

چوں کہ سرچشمۂ شریعت اساسی طور پر "قرآن وسنت" ہیں، اس لیے یہ ظاہر ہے کہ "اجتہاد" کا عمل انجام دینے والا شخص "قرآن وسنت" سے شرعی احکام دریافت کرنے کی کوشش کرے گا، جس کے لیے وہ قرآنی آیات اور نبوی حالات وہدایات کو اپنے غور وفکر کا موضوع بنائے گا اور اُن کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ "قرآن وسنت" کی اصل زبان چوں کہ خالص "عربی" ہے، اِس لیے "قرآن وسنت" کے صحیح فہم اور اُن سے استفادے کے حوالے سے عربی زبان اور اُس کی نزاکتوں، وسعتوں اور باریکیوں سے گہری واقفیت بنیادی طور پر ازحد لازم اور ضروری ہے۔

آیاتِ احکام کا علم

قرآنِ کریم کی وہ آیتیں جن کا تعلق فکرِ آخرت، اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتوں اور نشانیوں، اور عبرت و موعظت۔۔۔وغیرہ سے نہیں، بل کہ خاص طور پر احکام سے ہے، کم از کم اُن کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر اِسی کے ضمن میں آیاتِ قرآنیہ کے شانِ نزول سے واقفیت بھی آجاتی ہے، یعنی معتبر ذرائع سے یہ جانکاری ہونا کہ کون سی آیتیں کس پسِ منظر میں اتری ہیں اور کون سے احکام کس طرح کے حالات اور تناظر میں دیے گئے ہیں؛ تاکہ اُن آیات اور احکام کی صحیح منشا تک رسائی ہوسکے اور پھر اُس کی روشنی میں صحیح رُخ پر اجتہادی سرگرمی انجام دی جاسکے۔

احادیثِ احکام کا علم

ذخیرۂ احادیث میں سے وہ روایتیں جن کا تعلق احکام سے ہے، اُن تک علمی رسائی ہونا بھی اجتہادی عمل کی انجام دہی کے لیے ناگزیر ہے۔ اب ذخیرۂ احادیث میں ساری روایات یکساں طور پر مستند اور قابلِ اعتبار نہیں ہوتیں، بل کہ صحت وضعف کے لحاظ سے اُن کے بہت سے الگ الگ درجات ہوتے ہیں، تو اِس پہلو سے بھی "علمِ حدیث" سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے، خاص طور پر علمِ حدیث کی وہ شاخ جسے "علمِ اسماء الرجال" کہا جاتا ہے جس میں امت کے بہترین دماغوں نے بڑی چھان پھٹک کر کے حدیث کے راویوں کے حالات جمع کیے ہیں اور صحیح اور غلط راویوں کی نشاندہی کی ہے۔

ناسخ ومنسوخ سے واقفیت

یعنی متعلقہ آیات یا آپ ﷺ کے ارشادات وطرزِ عمل، نیز عہدِ رسالت کے پیش آمدہ حالات وواقعات کے بارے میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ زمانے کی تقدیم وتاخیر کے اعتبار سے اُن میں کیا ترتیب رہی ہے؛ کیوں کہ اِس کے بغیر بہت ممکن ہے کہ مثلاً کوئی صرف آپ ﷺ کے کسی ارشاد یا طرزِ عمل کو (اُسے ذخیرۂ روایات میں موجود پاکر) صرف اِس بنا پر اپنی تحقیق کی بنیاد بنائے کہ وہ آپ ﷺ کا ارشاد اور طرزِ عمل ہے، جب کہ حقیقت میں وہ اسلام کے ابتدائی دور میں کسی خاص مصلحت کے تحت کیا گیا کوئی وقتی عمل ہو، جسے بعد میں ترک کردیا گیا ہو!

اجماعی اور متفق علیہ مسائل کی جانکاری

یعنی تمام معتبر مکاتبِ فقہ کے متفق علیہ مسائل اور مختلف ادوار میں امتِ مسلمہ میں اہلِ علم اور ماہرینِ شریعت کی طرف سے کئے گئے اجماعی فیصلوں کا معلوم ہونا بھی اجتہاد کے شرائط میں سے ہے؛ کیوں کہ جن مسائل میں کسی موقف پر امت کے مجتہدین کا اتفاق ہوجائے اُن میں اُس اجماعی موقف سے اختلاف کرنا درست نہیں ہے۔

قیاس کے اصول اور طریقِ کار سے واقفیت

یعنی جب کوئی ایسی صورتِ حال پیش آجائے جس کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی دوٹوک واضح رہنمائی نہ مل سکے، نیز گزشتہ اہلِ علم اور ماہرین شریعت کا کوئی متفقہ نقطۂ نظر بھی اُس سلسلے میں موجود نہ ہو، اور ضرورت پڑ رہی ہو کتاب وسنت میں اُس صورتِ حال اور پیش آمدہ مسئلے کے نظائر تلاش کر کے اُن ہی جیسا حکم لگانے کی، جس کو "فقہ" کی خاص اصطلاح میں "قیاس" کہتے ہیں، تو اُس کی کیا شرائط اور حدود ہیں اور کیا اصول وضوابط ہیں، اُن کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

مصالح ومقاصدِ شریعت کا علم اور فہم

"شریعتِ اسلامی" صرف اوامر ونواہی کا ایسا خشک مجموعہ نہیں ہے کہ جس میں صرف بندوں کی اطاعت ونافرمانی کا امتحان مطلوب ہو، بس! بلکہ وہ کامیاب اُخروی زندگی کے ساتھ خوش گوار دنیوی زندگی عطا کرنے والے انسانی مصالح کی بھرپور رعایت پر مبنی ایک خوبصورت، متوازن، مکمل اور فطری نظامِ زندگی ہے۔ اِس لیے "اجتہاد" کا عمل انجام دینے والے کے لیے یہ بھی بہت ہی ضروری ہے کہ وہ شریعت کے مصالح ومقاصد کا عمیق علم اور معتدل فہم رکھتا ہو۔ اور وہ اُن مقاصد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھ کر اُن کو پورا کرنے والے وسائل وذرائع کو اِس زاویۂ نگاہ سے دیکھے کہ اُن میں کون سے وسائل شریعت کے اُن مقاصد ومصالح کو پورا کرتے ہیں اور کون سے ذرائع اُن کو پورا نہیں کرتے؟

زمانے کے حالات کا ادراک

تمدنی ارتقاء کا یہ فطری اور لازمی نتیجہ ہے کہ آئے دن ضروریاتِ زندگی سے متعلق نت نئی ایجادات ہوتی رہتی ہیں اور سوسائٹی میں معاشرت اور معاملات کی نئی نئی شکلیں بھی پیدا اور رائج ہوتی رہتی ہیں۔ اِسی طرح بعض مسائل اگرچہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئے نہیں ہوتے، لیکن حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اُن کے نتائج میں فرق آچکا ہوتا ہے۔

ایسے میں اُن ایجادات اور رواجوں کا پسِ منظر، اُن کا محرک بننے والے مقاصد، اِسی طرح سماج پر اُن کی وجہ سے مرتب ہونے والے اثرات ونتائج، اور پھر معاشرے کو اُن کی ضرورت ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ، اِن سب باتوں کا اچھی طرح معلوم ہونا بھی "اجتہاد" کرنے والے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ورنہ وہ شرعی احکام کے بے محل انطباق کی سنگین غلطیاں کر بیٹھے گا اور لوگوں کو حرج اور غیر ضروری تنگی میں مبتلا کر دے گا۔ اُس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے دور کے احوال سے اچھی طرح واقف ہو، وہ گہرائی کے ساتھ جانتا ہو کہ مختلف شعبہائے زندگی میں اِس وقت کیا عرف چل رہا ہے؟ کس طرح کی عادات اور معاملات معاشرے میں اِس وقت رائج ہیں؟ لوگوں کی اخلاقی حالت کیسی ہے؟ اِس کے بغیر وہ "شریعتِ اسلامی" کو زمانے اور اُس کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رکھ سکتا۔

فکر صحیح اور تقویٰ

یہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے جس سے متصف ہونا مجتہد کے لیے ضروری ہے۔ اُس کے لیے لازم ہے کہ اُسے "شریعتِ اسلامی" کی جامعیت، فطریت، اُس کی ابدیت وعالم گیریت اور کامل ومکمل نظامِ حیات ہونے پر پورا پورا شرحِ صدر اور کامل یقین اور اطمینان حاصل ہو۔ وہ دنیا میں رائج دیگر فلسفوں اور نظامہائے حیات کے حوالے سے ذرہ برابر بھی ذہنی مرعوبیت کا شکار نہ ہو۔ ورنہ اسلام کے اِن نادان دوستوں سے رہبری کی شکل میں ہمیشہ رہزنی کا ہی کام ہوا ہے۔

نیز اِسی طرح مجتہد کی زندگی گناہوں سے پاک صاف اور پابندِ شریعت ہو، یہ بھی بنیادی حیثیت سے بے انتہاء لازم اور ضروری ہے۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ خوفِ الٰہی اور فکرِ آخرت کے بغیر کی جانے والی اجتہادی سرگرمیوں سے شریعت کی رہنمائی نہیں، دین کی تحریف جنم لیا کرتی ہے [1]۔

---

[1] یہاں اجتہاد کی جن شرائط کا ذکر کیا گیا ہے، اُن کے بارے میں مکمل تفصیلات، نیز مزید شرائط جاننے کے لیے "اہلِ علم" اِن کتابوں کی مراجعت کریں:

عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید	از: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
المستصفی	از: حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ
الموافقات	از: علامہ ابو اسحاق شاطبی رحمۃ اللہ علیہ
رسائل ابن عابدین	از: علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ
الاِحکام	از: علامہ آمدی

بہر کیف ۔۔ یہ وہ کم از کم لازمی شرطیں ہیں جن کا کوئی سمجھ دار اور ہوش مند انسان انکار نہیں کرسکتا؛ اس لیے کہ یہ بات محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ اِن مذکورہ بالا اوصاف کا حامل ہوئے بغیر "اجتہاد" کی اہلیت کا ("اجتہاد" کی جو حقیقت پہلے بتائی گئی، اُس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے) کوئی مطلب نہیں ہے۔ یہ بالکل ظاہر سی بات ہے کہ اگر "اجتہاد" کرنے والے میں یہ اوصاف نہ ہوں تو پھر "اجتہاد" مذاق بن کر رہ جائے گا!

خلاصۂ کلام:

یہاں تک کی پوری بات کا حاصل یہ ہے کہ انسانیت کی صلاح وفلاح کے لیے آسمانی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے، انسانیت کسی قیمت پر اُس سے بے نیاز نہیں قرار دی جاسکتی۔ اب دنیا کے اختتام تک ہر دور میں "محمد رسول اللہ" ﷺ اور "قرآنِ مجید" آسمانی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں گے، جس کی صورت "اجتہاد" کا نظام ہے۔ اور "اجتہاد" کے بارے میں معتدل طرزِ فکر یہ ہے کہ یہ انتہائی ضروری بھی ہے اور غیر معمولی اہلیت کا متقاضی بھی۔ اگر "اجتہاد" نہیں ہوگا تو "شریعتِ اسلامی" کی ابدیت پر حرف آئے گا اور اگر وہ نااہلوں کے سپرد کردیا جائے گا تو بازیچۂ اطفال بن جائے گا اور دین تحریفات کا شکار ہوجائے گا۔

اب آخر میں یہ جان لینا بھی فائدے سے خالی نہیں ہوگا، بل کہ ایک اعتبار سے ضروری ہے کہ "اجتہاد" کس نوعیت کے مسائل میں کیا جاتا ہے؟ کیوں کہ ہمارے اِس دور میں "اجتہاد" کا شوق رکھنے والے بہت سے حضرات کی طرف سے ایسے مسائل کو بھی "اجتہاد" کا موضوع بنایا جارہا ہے، جن میں "اجتہاد" کی علمی نقطۂ نظر سے، سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

"اجتہاد" کا دائرۂ کار:

"اجتہاد" کی جو حقیقت پہلے بیان کی گئی ہے، اُس کے پیشِ نظر یہ بات واضح ہے کہ "اجتہاد" میں مسائل کا استنباط "قرآن وسنت" سے کیا جاتا ہے۔ اب "قرآن وسنت" کی نصوص کے حوالے سے، بنیادی طور پر دو باتیں ہیں:

۱۔ **اُن کے ثبوت کا یقینی اور غیر یقینی یا ظنی ہونا۔**

۲۔ **اُن کی اپنے معنیٰ ومفہوم پر دلالت کا واضح اور غیر واضح یا مبہم ہونا۔**

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، تو اِس اعتبار سے "قرآنِ مجید" تو پورا کا پورا یقینی اور قطعی الثبوت ہے۔ اور ذخیرۂ احادیث میں سے "متواتر" حدیثیں یقینی اور قطعی الثبوت ہیں۔ اور جو حدیثیں متواتر نہیں ہیں، وہ ظنی الثبوت ہیں۔

اور جہاں تک اپنے معنیٰ اور مفہوم پر دلالت کی بات ہے تو قرآن کی بہت سی آیات واضح الدلالۃ ہیں اور بہت سی غیر واضح اور مختلف معانی اور مفاہیم کا احتمال رکھنے والی، اور یہی معاملہ احادیث کا بھی ہے کہ اُن میں سے بھی کچھ غیر مبہم اور واضح المعنی ہیں اور کچھ مبہم اور غیر واضح المعنٰی۔

اب جو مسائل "یقینی طور پر ثابت اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح نصوص" سے ثابت شدہ ہیں، جیسے بنیادی اعتقادی مسائل اور عملی مسائل میں سے مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی فرضیت، تعددِ ازدواج، مردوں کے لیے طلاق کا حق اور حدود وقصاص وغیرہ تو تسلسل کے ساتھ پوری امت کے معتبر اہلِ علم کا بجا طور پر یہ اجماعی موقف ہے کہ اِن مسائل میں "اجتہاد" کی کوئی گنجائش نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ چیزیں قطعی اور صریح نصوص سے ثابت شدہ ہونے کی وجہ سے "دائرۂ اجتہاد" سے باہر ہیں۔ لہٰذا ایسے مسائل میں "اجتہاد" کرنے کی کوشش کرنا، اور اِس طرح قطعی احکام سے انحراف کی راہ اختیار کرنا، یہ "اجتہاد" نہیں، بل کہ "تجدد" کے زیرِ اثر دین وشریعت کے ساتھ کھلواڑ کرنا ہے۔

ہاں ایسے مسائل جن کا منبعِ استنباط "ظنی الثبوت اور ظنی الدلالۃ نصوص" ہیں، وہ بلاشبہ "اجتہاد" کے دائرے میں آتے ہیں، اور "اجتہاد" کا محل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ عطا فرمائے، آمین! والحمدلله اولاً واٰخراً وظاهراً وباطنا

☆☆☆

الفرقان کی ملکیت ودیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھئے قاعدہ نمبر ۸)

مقامِ اشاعت	پرنٹر وپبلشر کا نام وپتہ قومیت	ایڈیٹر کا نام وپتہ، قومیت	ملکیت
لکھنؤ	محمد حسان نعمانی، (۳۱، نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ) ہندوستانی	خلیل الرحمٰن سجاد، (۳۱، نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ) ہندوستانی	خلیل الرحمٰن سجاد (پروپ رائٹر)

میں محمد حسان نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین میں بالکل صحیح ہیں۔

دستخط: محمد حسان نعمانی

مولانا محمد ابوبکر پورنوی قاسمی ☆

حضرت نانوتویؒ کی دینی حمیت
اور
موجودہ دور میں اس کی ضرورت واہمیت

سورۃ الفتح کی آخری آیت میں اللہ تعالی نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعارف کراتے ہوئے سب سے پہلے ان کی جس صفت کا تذکرہ کیا ہے وہ ہے ان کی دینی حمیت اور اسلامی غیرت ﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (الفتح:۲۹) "اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کفار کے تئیں بڑے سخت ہیں" یعنی دین وایمان کے خلاف اٹھنے والے طوفانوں اور اس پر حملہ آور فتنوں کے مقابلے میں آہن وفولاد بن کر کھڑے ہونے کا حوصلہ اور اس کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دینے حتی کہ اپنی جان تک قربان کر دینے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کا ہر عمل بلکہ زندگی کا ہر لمحہ حتی کہ آخری سانس سب کچھ خدا اور اس کے دین کی خاطر نچھاور تھا ﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ "میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالن ہار ہے" (الانعام: ۱۶۳) اسی مفہوم کو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ؎

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی　　میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایمانی حمیت کا اندازہ سیکڑوں آیات واحادیث کے ساتھ ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس تاریخی جملے سے بھی ہوتا ہے، جو انہوں نے "ادارۂ خلافت" کو زکوۃ دینے سے انکار کرنے والوں کے خلاف جہاد کرنے کے حوالے سے ارشاد فرمایا تھا: "أينقص الدين وأنا حي" [۱] (یعنی

☆ رفیق شعبۂ تحقیق، معہد الامام ولی اللہ الدھلوی

[۱] جامع الاصول فی احادیث الرسول، مصنف: ابوالسعادات ابن الاثیر، ط: اول، مکتبہ دارالبیان، رقم: ۶۴۲۶، باب ابوبکر صدیق، ج: ۸، ص: ۶۰۱۔

میرے جیتے جی دین کے اندر نقص اور کمی آجائے یہ ممکن نہیں)

حضرت صدیق اکبرؓ سے حضرت نانوتویؒ کا نسبی اور روحانی رشتہ

صحابہ رضی اللہ عنہم کی حمیتِ ایمانی کا حصہ ہر دور میں ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کو نصیب ہوتا رہا اور وہ بہت کٹھن مرحلوں میں بھی جان کی بازی لگا کر حفاظتِ دین، اشاعتِ دین اور اقامتِ دین کے فرائض انجام دیتے رہے، انہی جانبازوں میں ایک بڑا نام حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ کا بھی ہے، جن کے بارے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کو نسبی اور روحانی دونوں رشتوں سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حمیتِ دینی سے وافر حصہ ملا ہوا تھا، جو انھیں ہمیشہ بے تاب ومضطرب رکھتا تھا اور ان کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا، جس کی گواہی ان کی زندگی کا ہر ورق دیتا ہے۔

چنانچہ یہی وہ حمیتِ ایمانی تھی جس نے انھیں باپ کے اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود ظالم انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے ابھارا اور جن حضرات نے اسباب کی کمی یا امیر نہ ہونے کا حوالہ دیکر جنگ نہ کرنے کی رائے ظاہر کی ان کو جنگ بدر میں قلت اسباب کی یاد دہانی کرائی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر کے مطمئن کیا اور بالآخر شاملی کے میدان کارزار میں ہمت وجوانمردی کے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جنھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

پھر یہی غیرت اسلامی کبھی انھیں چاندا پور ضلع شاہجہاں پور کے "میلۂ خدا شناسی" میں لے جاتی ہے اور بزم مباحثہ میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کے سامنے اسلام کی حقانیت اور اس کی برتری ثابت کرواتی ہے تو کبھی ضعف وکمزوری اور علالت ونقاہت کے باوجود رڑکی اور میرٹھ کا سفر کرنے پر مجبور کرتی ہے اور آریہ سماجیوں کے تیز وتند اعتراضات کے دنداں شکن جوابات دلوا کر اسلام کے حوالے سے شکوک وشبہات کا قلع قمع کر وادیتی ہے۔ نیز اسی ایمانی حمیت کی بنا پر حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ نے اصلاح معاشرہ کی کوششوں کے تحت نکاح بیوگان کا احیاء کیا، لڑکیوں کے حق وراثت کی لڑائی لڑی اور شیعیت کے زیر اثر ماتم وتعزیہ داری کی جڑ پکڑی ہوئی رسموں کو اکھاڑ پھینکا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انتہائی نامساعد حالات اور بے سروسامانی کے عالم میں اسلام کی حفاظت وبقاء کے لیے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈال کر مدارس اسلامیہ کی تحریک شروع کی۔

حمیت دینی کی بنا پر آپ کے اپنی جان تک قربان کردینے اور سر کی بازی لگا دینے کے جذبے کا پتہ شاملی کے میدان کارزار کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی ہوتا ہے، جس کے راوی حضرت مولانا

قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمۃ ہیں۔

"محل کی مسجد"، جس میں آج کل مولانا حسین احمد صدر دار العلوم دیوبند پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔ یہی مسجد دیوان جی (حاجی محمد یٰسین) کے محلہ کی مسجد تھی، تعزیہ اس مسجد میں بھی رکھا جاتا تھا اور محرم میں اسی مسجد سے وہ تعزیہ اٹھتا تھا، اٹھانے والے سنی ہوتے تھے، کچھ شیعہ گھرانے بھی اس جگہ تھے دیوان جی نے سب سے پہلے اپنے محلہ کی اسی مسجد کو تعزیہ کے قصہ سے پاک کرنے کا ارادہ کیا اور اعلان کر دیا کہ اس سال اس مسجد سے تعزیہ نہیں اٹھے گا، یہ کوئی معمولی اعلان نہ تھا، دیوبند کی شیعہ آبادی ہی نہیں بلکہ تعزیہ پرست سنیوں میں بھی اس اعلان سے کھلبلی مچ گئی اور اس محلہ کے شیوخ بگڑ گئے اور کہا کہ سر قلم ہو جائیں گے، مگر تعزیہ اٹھے گا۔ یہ سن کر دیوان جی کی زبان سے بھی بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ اگر گذرا تو میری لاش پر سے گذرے گا، پھر بتدریج محلہ سے آگے بڑھ کر فتنہ کی آگ سارے قصبے میں پھیل گئی اور شیوخ کی برادری دیوان جی کے خلاف متحد ہو گئی۔ حضرت (نانوتویؒ) کے علم میں جب یہ آیا اور معلوم ہوا کہ موقع پر شہر میں عظیم ترین ہنگامہ بپا ہونے کا خطرہ ہے، تو ایک دن جب دیوان جی حضرت والا کی مجلس مبارک میں حاضر تھے اور اسی مجلس میں شہر کے اکابر شیوخ اور دوسری برادریوں کے بڑے موجود تھے۔ سیدنا الامام الکبیر حضرت نانوتویؒ دیوان جی کو مخاطب بنا کر فرمانے لگے کہ "بندۂ خدا اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کم از کم مجھ سے ذکر تو کر لیا ہوتا" یہ بات تو دیوان جی سے کہی گئی اور اس کے بعد اسی بھری مجلس میں حضرت والا کی طرف سے بھی عام اعلان فرما دیا گیا کہ "لیکن خیر اب اگر ایسا کہہ دیا گیا ہے، تو دوسرا سر قاسم کا لگا ہوا ہے" مطلب یہ تھا کہ اپنی لاش پر دیوان جی نے اعلان کیا تھا کہ تعزیہ گزرے گا اسی لاش کے ساتھ دوسری لاش جسے تعزیہ لے جانے والے اپنے قدموں کے نیچے پائیں گے وہ محمد قاسم کی لاش ہوگی [1]۔"

صفتِ صدیقی "أینقص الدین و أنا حي" کی زندہ مثال

اس واقعہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے تاریخی جملے "أینقص الدین و أنا حي" کی ہلکی سی جھلک محسوس کرنے والوں کو محسوس ہو سکتی ہے۔ اور صرف یہی ایک واقعہ نہیں؛ بلکہ ان کی زندگی کا اصل مقصد ہی دین کی حفاظت و اقامت اور اس کا احیاء و دفاع تھا؛ اسی لیے انھوں نے کوئی تقریر و تحریر یا تحقیق برائے تحقیق پیش نہیں کی؛ بلکہ ہر قدم تحفظِ دین اور اسلامی تہذیب کی اقامت و اشاعت کے لیے اٹھایا، زبان و قلم کا سہارا لیا ہو یا عملی جد و جہد اور اصلاحی کوششیں سب کا محور وہی ایک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زیادہ

[1] سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۷۴-۷۶

تر تالیفات اسلام کے عقائد حقہ کی ترجمانی اور اہل باطل کی نفی وتردید پر مشتمل ہیں۔

عاجز راقم نے حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کی ایمانی حمیت کا اجمالا تذکرہ کرنے کے لیے جن واقعات کی طرف محض اشارہ کیا ہے، ان واقعات کی تفصیل اور ان کے پس منظر کو دیکھ کر ہی حضرت کی حمیتِ دینی کا حقیقی اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کن ناگفتہ بہ اور سنگین حالات میں ملت اسلامیہ اور علوم اسلامی کی پاسبانی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسلامی فکر، اسلامی تہذیب اور اسلامی تشخص پر انگریزی حکومت، اس کے نظام تعلیم اور اس کے زیر اثر پادریوں نیز آریہ سماجیوں کی طرف سے ہونے والے چوطرفہ منصوبہ بند حملوں کے مقابلے کے لیے کس طرح مرد آہن بن کر ہر میدان میں ڈٹے رہے اور باطل کے ناپاک ارادوں اور سازشوں کو کس عزم وحوصلے، ہمت وجرأت اور حکمت وبصیرت کے ساتھ ناکام کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان نامساعد حالات کی پوری تفصیل اس مختصر سے مضمون میں مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

دورِ نانوتویؒ کے تین دفاعی محاذ

بس خلاصہ کے طور پر اتنا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت داخلی فساد وبگاڑ کے علاوہ خارجی اعتبار سے بنیادی طور پر تین محاذ کھلے ہوئے تھے، جن پر کام کرنے کے لیے کسی غیرت دینی سے معمور، فولادی عزم وحوصلے والے، حقیقت آگاہ اور زمانہ آشنا مرد آہن کی ضرورت تھی۔

☆ ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی قوت کی بحالی اور ایک طویل عرصے تک حکومت کرنے والی امت کی عظمت رفتہ کی بازیابی کا مسئلہ تھا۔

☆ دوسری طرف غیر اسلامی جماعتوں سے نظریاتی جنگ درپیش تھی، آئے دن مختلف جہتوں سے اسلامی عقائد واحکام پر حملے کیے جارہے تھے اور اسلامی تصورات کی غلط تعبیرات پیش کی جارہی تھیں۔ چنانچہ دو مرتبہ چاندا پور ضلع شاہجہاں پور کا "**میلۂ خداشناسی**" اور بانی آریہ سماج دیانند سرسوتی اور اس کے چیلوں کا رڑکی، میرٹھ اور دیگر شہروں میں اسلام کے خلاف زہر افشانی اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ ضرورت تھی کہ ان حملوں کا بھرپور مقابلہ کیا جائے اور اسلامی عقائد واحکام کے حقیقی خدوخال جدید سائنٹفک انداز میں پیش کیے جائیں۔

☆ تیسری جانب ملک میں مسلمانوں کی جہالت وافلاس کی وجہ سے اور انگریزی نظامِ تعلیم کے ذریعے ذہنی ارتداد کی وبا پھیل رہی تھی بلکہ ایک بڑے منصوبے کے تحت پھیلائی جارہی تھی، ضرورت تھی کہ مسلمانوں میں ٹھوس دینی تعلیمات عام کی جائیں اور اس کے لیے پورے ملک میں دینی اداروں کا جال بچھایا جائے تاکہ یہ امت اپنے حقیقی دین پر پورے شرح صدر کے ساتھ قائم رہے اور اسلاف کے علمی ودینی اثاثوں کی

حفاظت کر سکے۔ حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ نے داخلی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان تینوں محاذوں پر کام کیا۔

میدانِ شاملی

انگریزوں کے ذریعہ مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت چھن جانے اور سیاسی وسماجی، اقتصادی ومعاشی اور دینی و مذہبی پامالی کی وجہ سے ان کے دلوں میں انگریزوں کی نفرت وعداوت اور انتقام کا جذبہ ایک فطری بات تھی۔ چنانچہ جب ۱۸۵۷ء میں میرٹھ چھاؤنی کے اندر کارتوسوں میں گائے اور خنزیر کی چربی والے معاملے کو لے کر فوجیوں نے بغاوت کر دی اور انگریز افسروں کو گولیوں سے بھون ڈالا تو اس بغاوت کی لہر پورے ملک میں پھیل گئی، جس کا سب سے زیادہ اثر یوپی کے مغربی اضلاع پر پڑا اور لوگوں میں جہادِ حریت کا جذبہ مستحکم ہو گیا نیز انگریز فوج کی بھی ادھر کڑی نظر ہو گئی اور اس جہادِ حریت کو، جس کو انھوں نے بغاوت کا نام دیا تھا، ختم کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ اسی کا اثر تھا کہ قصبہ تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی کے بھائی قاضی عبدالرحیم جب انہی دنوں میں ہاتھی خریدنے کے لیے چند ساتھیوں کے ھمراہ سہارنپور گئے تو ان سب کو انگریز پولس نے بلا تحقیق وتفتیش بغاوت کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا، جس کے ردِعمل کے طور پر ان کے بھائی قاضی عنایت علی نے تھانہ بھون سے قریب شیر علی کے باغ میں انگریز ی سپاہیوں کے ایک وفد پر حملہ کیا، جو بہت سے کارتوس اور ہتھیار لے کر سہارنپور سے کیرانہ جا رہا تھا اور ان کو قتل کر کے ان کا سارا ساز وسامان لوٹ لیا۔

علماء کرام اور خصوصاً حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء جو سب سے زیادہ حساس تھے، وہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے؛ کیوں کہ ان کو مادی وجود سے زیادہ دینی وجود کا خطرہ لاحق تھا؛ لہذا انھوں نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی سربراہی میں مشورہ کیا اور جن حضرات نے قلتِ اسباب یا امیر نہ ہونے کی دلیل دے کر دینی اعتبار سے جہاد نہ کرنے کی رائے ظاہر کی تو حضرت نانوتویؒ ہی نے جنگ بدر میں اسباب کی کمی کا حوالہ دیا اور امیر المؤمنین کے لیے حضرت حاجی صاحبؒ کے ہاتھ پر سب سے پہلے بیعتِ جہاد کر کے ایک اہم ترین مسئلہ کا بہترین حل پیش کر دیا، جس کے بارے میں کسی کو لب کشائی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

چنانچہ ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں آپ نے بہ نفسِ نفیس عملی طور پر حصہ لیا اور میدان شاملی میں چیف کمانڈر کی حیثیت سے قائدانہ اور انتہائی سرفروشانہ کردار ادا کیا۔

اسی میدان شاملی کے اور کئی واقعات ہیں جو حمیت اور ہمت وجوانمردی کے بین ثبوت ہیں، لیکن

مقصد واقعات کا احاطہ نہیں بلکہ ہمیں اپنے اندر اس اسپرٹ کو پیدا کرنا ہے۔

جہادِ حریت میں ناکامی اور قیامِ مدارس کی تحریک

مختصر اعرض ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کی عمومی شکست اور اس کے ہولناک واقعات کے بعد انگریزوں نے صرف اپنا نظام حکومت ہی نہیں، بل کہ اپنا مکمل دستورِ حیات غلام ہندوستان پر مسلط کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت جھونک دی۔ چنانچہ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں اس کے ممبر مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: "ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے۔" [۱]

اس مقصد کی تکمیل کے لیے ان کا اولین حملہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر تھا، جو پورے اسلامی معاشرے کی بنیاد تھا۔ لہٰذا ہزاروں مدارس ومکاتب جو سلاطین وامراء کی وقف کردہ جائدادوں سے چل رہے تھے، اس انقلاب کی نذر ہو گئے اور ان تمام اوقاف کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے بحق سرکار ضبط کر لیا۔ چنانچہ ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ: "مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸/ سال کی لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم بند ہو گئے [۲]۔" کیونکہ انگریز یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمان قرآن کریم پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور جب تک وہ اس کتاب سے وابستہ رہیں گے انگریز حکومت کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہنری ٹامس کہتا ہے کہ: "مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے، جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے؛ اس لیے کہ قرآنی احکام کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔" [۳]

اس لیے انھوں نے اسلامی طرزِ فکر کو فرسودہ اور دینی قدروں کو دہقانیت قرار دیکر مدارس ومکاتب کے بالمقابل برطانوی نصاب تعلیم جاری کر کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں کے قیام کا آغاز کیا، جن کا مقصد خود ہندوستان میں انگریزی نظامِ تعلیم کی کمیٹی کا صدر لارڈ میکالے اپنی رپورٹ میں بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے اعتبار سے فرنگی۔" [۴] اسی معنی کو ادا کرنے کے لیے میجر باسو نے لارڈ میکالے کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے، جو ہمارے اور ہماری رعایا کے درمیان مترجم کا کام دے سکے، یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔" [۵]

---

[۱] حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ۔۔حیات، افکار، خدمات، ص: ۱۴۰۔
[۲] ایضاً، ص ۱۳۸۔
[۳] حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ۔۔حیات، افکار، خدمات، ص: ۱۴۰۔
[۴] ایضاً، ص: ۱۴۰۔
[۵] تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی، ج: ۱، ص: ۸۲-۸۳۔

ان اداروں میں ناپختہ کاروں کے لئے کشش کا ہر سامان مہیا تھا، ظاہری رنگارنگی بھی تھی اور فراغت کے بعد سرکاری ملازمتوں کی دلفریبی بھی، جس کے نتیجے میں جدید تعلیم اور اس کا طریق کار تیزی کے ساتھ شہر شہر اور قریہ قریہ رواج پانے لگا۔ یوں تو اس دور کے سبھی اکابر علماء ملکی حالات اور مسلمانوں کی قومی ابتری سے پریشان تھے، مگر ضرورت تھی کہ کوئی فولادی عزم وحوصلے والا مرد خدا کھڑا ہو اور اپنی فکری بصیرت سے انگریزی استعمار کے اس طویل منصوبے کو ناکام بنانے کا حل پیش کرے اور ان نامساعد حالات میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سامنے آئے؛ لہٰذا حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء نے توفیق الٰہی کے مطابق اپنی رسا فکر اور دور بیں نظر سے ایسا حل تلاش کیا جو ان حالات میں واحد تعمیری طریق تھا اور قوم کو ذہنی غلامی سے نجات دلانے کا کیمیا اثر نسخہ تھا۔ اور وہ حل تھا علاج بالمثل کا کہ جدید تعلیم کے اثر کا جواب طریق تعلیم سے دیا جائے۔ یعنی اگر مغربی تعلیم تاریخ واسلاف سے بے گانہ بنا رہی ہے اور ان کے اندر مذہب بیزاری کا بیج بو رہی ہے تو اسی تعلیمی راہ سے مسلمانوں کو اس زہر سے بچایا جائے اور دینی تعلیم کے مراکز قائم کر کے مسلم بچوں میں اسلام پسندی اور اسلامی اقدار کے احترام وتحفظ کا جذبہ بیدار کیا جائے۔

اس بنیادی تصور کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کے ذہن رسا نے اس راہ کی مشکلات پر غور کرتے ہوئے توفیق خداوندی سے اس تحریک کا آغاز ایک چھوٹی سی گمنام بستی (دیوبند) کی چھوٹی سی مسجد (مسجد چھتہ) سے کیا، تاکہ انگریز حکومت کو اس کے بارے میں شک وشبہ نہ ہو اور ان کی نظر نہ لگنے پائے، جو ان کی حکمت ودانائی اور کمال بصیرت کی واضح دلیل ہے۔ اسی طرح ان کے روشن دماغ نے آزاد تعلیم کے لیے آزاد ذریعۂ آمدنی کا نکتہ بھی ڈھونڈ نکالا، یعنی عوامی مدرسے کے مصارف عوامی چندے سے پورے ہوں جو سرتاپا اخلاص پر مبنی ہوں اور دینے والا اپنا پیسہ احسان جتا کر نہ دے؛ بل کہ اس کو توشۂ آخرت سمجھ کر دے اور اس طرح خود ہی پیسہ دے کر خود کو مدرسے کا احسان مند قرار دے کہ اس انفاق وامداد کی وجہ سے اس کی آخرت سنور سکتی ہے۔ اسی بنیادی نقطہ کے ساتھ ۳/مئی ۱۸۶۶ء مطابق ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ بروز جمعرات دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ پھر مدرسہ شاہی مرادآباد، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ منبع العلوم گلاوٹھی بلند شہر، اسی طرح امروہہ، میرٹھ اور دیگر کئی شہروں میں حضرت نانوتویؒ کے ذریعہ مدرسے قائم ہوئے اور اس کے بعد اسی تحریک کے تحت پورے ہندوستان میں مدارس کا جال پھیلا کر انگریزوں کے ناپاک منصوبے کو ناکام بنایا گیا۔

یقیناً حضرت نانوتویؒ کے اندر حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی ہی کا وہ جوہر تھا، جس نے آپ کو ایک میدان میں ناکامی کے بعد بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا؛ بل کہ آپ نے ہمت کے ساتھ ساتھ حکمت وبصیرت سے کام لیتے ہوئے دوسرا مورچہ سنبھالا، تاکہ اس کے ذریعہ حفاظتِ دین کا کام بھی ہو اور پہلے مورچہ کے لیے افراد بھی

تیار ہوسکیں۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمۃ قیام دارالعلوم کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اسی لائحۂ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی وجوہری عنصر تھا۔" [۱] پھر چند صفحات کے بعد اس سلسلے میں حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کا قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند نے فرمایا: "حضرت الاستاذ (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس، تعلیم وتعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ ۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔ آخر میں فرمایا: صرف تعلیم وتعلم، درس وتدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں؛ لیکن اپنے لیے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے، جس کے لیے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔" [۲]

خانوادۂ قاسمی کے چشم وچراغ حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم اسی مقصد کو بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "حضرت الامام نے اپنی فراست آمیز اسلامی سیاست سے۔۔۔ اپنا محور فکر ملت کی ان فطری صلاحیتوں کو بنایا کہ جو عہد مغلوبیت میں مستور تو ہوسکتی ہیں؛ لیکن معدوم نہیں ہوتیں اور قیادت سلیمہ پر بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ صلاحیتیں بروئے عمل آنے کے بعد شکست خوردگی کے بجائے "ہمت آفریں شعور" ذلت ومغلوبیت کے بجائے حوصلہ مندانہ عزم، رفعت پسندانہ اقدامات کے نتائج کے بارے میں شکوک وشبہات کے بجائے کامیابی کا یقین اور با اقتدار معاند قوتوں کے سامنے خود سپردگی کے بجائے غیرت مندانہ موقف استقامت قومی زندگی کے دھارے میں انقلاب برپا کرنے کا ایسا مؤثر ذریعہ بنتے ہیں کہ جس کا ادنی تصور بھی مغلوبیت ومفتوح ملت کو محض پست فکری اور یاس وناامیدی سے نکالنے کے طرز قیادت میں متصور نہیں ہوسکتا۔" [۳]

سب کا حاصل یہی ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے سامراجی تسلط سے آزادی حاصل کرنے، اس کے نظام تعلیم کے ذریعہ اسلامی تہذیب وتشخص کو مٹانے کے ناپاک منصوبے کو ناکام بنانے اور اعلاء کلمۃ اللہ کو اپنی

---

[۱] سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۲۲۳۔ [۲] ایضاً، ۲۲۶۔ [۳] حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ حیات، افکار، خدمات (مجموعہ مقالات حجۃ الاسلام سیمنار) دوسرا ایڈیشن: ۲۰۰۷ء تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، نئی دہلی، ص:۶۲-۶۳۔

زندگی کا مقصدِ اولیں بنایا اور میدانِ شاملی کے بعد اس کا بہترین حل تلاش کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور قیام مدارس کی تحریک شروع کی۔

تیسرے محاذ کے سلسلے میں مذکورہ اشارہ پر اکتفاء کرتے ہوئے یہاں آپ کی دینی حمیت کے ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے جنگ بلقان کے مجاہدین کا مالی تعاون اور اس میں شرکت کے مقصد سے حجاز کا سفر۔

جنگ بلقان کے مجاہدین کی اعانت وامداد

حضرت نانوتویؒ کی حمیت دینی اور غیرت ملی کا ایک بہت اہم باب جنگ بلقان میں مجاہدین کا مالی امداد وتعاون اور اس جہاد میں بنفس نفیس شرکت کے مقصد سے حجاز کا سفر ہے، جو اتفاق سے مشہور نہیں ہوا۔ یعنی جب نکولس کے بیٹے الگزنڈر دوم شاہِ روس نے مارچ ۱۸۵۶ء (رجب ۱۲۷۳ھ) کے صلح نامے کے باوجود بغیر کسی معقول وجہ کے ترکی (عثمانی) حکومت کی فوج پر اچانک ۱۸۷۴ء (۱۲۹۴ھ) میں ایک بڑا حملہ کر دیا، تو ترکی فوج کو مقابلہ میں سخت پریشانی ہوئی اور یکے بعد دیگرے بلقانی ریاستوں کے علاقے عثمانی خلافت کے ہاتھوں سے نکلتے چلے گئے۔ اسی موقع پر حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء سربکف میدان میں آئے اور ان کی حمایت کے لیے مالی امداد وتعاون کے ساتھ ساتھ حجاز، پھر وہاں سے ترکی حکومت کے زیر انتظام جنگ کے میدان میں جانے کا فیصلہ کیا، اگرچہ وہ حجاز ہی سے حالات کا جائزہ لے کر واپس آ گئے۔ حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی لکھتے ہیں:

> "اس وقت (۱۸۵۶ء) تو صلح نامہ ہو گیا تھا مگر بعد میں روس نے سمجھا کہ یہ صلح نامہ اس کے ارادوں کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے اس نے بغیر کسی معقول وجہ کے عثمانی (ترکی) حکومت کی فوج پر ۱۸۷۴ء (۱۲۹۴ھ) میں ایک اور بڑا حملہ کر دیا۔ ۱۸۵۶ء کے معاہدہ کی وجہ سے اس طرح کے کسی حملہ کی امید نہیں تھی اور یہ حملہ اچانک ہوا، جس کی وجہ سے ترکی فوج اور مقامی ریاستوں کے ذمہ داروں اور فوجی افسروں کو مقابلہ میں سخت پریشانی کا سامنا ہوا، اس پریشانی کو ان ریاستوں کے درمیان سخت اختلافات اور باہمی پنجہ کشی نے بہت بڑھا دیا تھا، جس کے نتیجہ میں ایک کے بعد ایک بلقان ریاستوں کے علاقے ترکی حکومت کے ہاتھوں سے نکلتے چلے گئے۔ یہی وہ موقع تھا جب ہندوستان کے علماء کے قائدین سربکف میدا

---

۱ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ احوال وآثار وباقیات، حضرت مولانا نورالحسن راشد صاحب کاندھلوی، ط: اول ۲۰۰۰ء، مکتبہ نور، کاندھلہ، مظفرنگر، یوپی، ص: ۹۵-۹۶۔

ن میں آئے اور مشرقی یورپ کے مسلمانوں کی حمایت کے لیے حجاز، وہاں سے ترکی حکومت کے زیر انتظام جنگ کے میدان میں جانے کا فیصلہ کیا۔"[۱]

حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ جو دینی غیرت کے پتلے اور خود کو عالمی ملی کارواں کا ناچیز خادم اور معمولی حصہ سمجھتے تھے، اس حادثہ سے شاید سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ حضرت ہی کی سربراہی اور سرپرستی میں یہ اہم اور تاریخی فیصلہ کیا گیا کہ ہم سب خلافتِ اسلامیہ اور مشرقی یورپ کے مسلمانوں کی مدد کے لئے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، اس کے لیے بھرپور کوشش کریں گے اور اس تعاون وکوشش کی دو صورتیں ہوسکتی تھیں۔

(۱) مشرقی یورپ کے مسلمان مجاہدین اور ترکی فوج کے جوانوں اور جنگ کے شہداء کے یتیموں اور بیواؤں کی مالی امداد، جس سے ان کے حوصلوں میں توانائی آئے اور وہ خود کو تنہا محسوس نہ کریں اور ان کو یاد رہے کہ ہندوستان میں بھی ان کے دینی بھائی موجود ہیں، جو ان کی مصیبت کے موقع پر ان کے ساتھ اور ان کے رنج والم میں برابر کے شریک ہیں؛ لہذا اس کے لیے حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے عام مسلمانوں سے بڑی رقم اکٹھی کر کے بابِ عالی (مرکزی حکومت ترکی، استنبول) بھجوانے کی کوششیں شروع کیں۔ حضرت نانوتویؒ نے سب سے پہلے مدرسہ دیوبند (دارالعلوم دیوبند) کے سب ذمہ داروں، مدرسین، طلباء اور اہلِ قصبہ دیوبند سے تعاون کی درخواست کی، اس کے علاوہ اپنے سب شاگردوں، متوسلین، نیازمندوں اور مدرسہ کے ذمہ داروں کو ادھر متوجہ فرمایا اور دیوبند، نانوتہ، گنگوہ، تھانہ بھون، کاندھلہ اور اطراف کے قصبات اور شہروں کے علاوہ دور دراز شہروں میں بھی اس درخواست کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ صرف دیوبند قصبہ، دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ، منتظمین اور طلبہ نے تقریباً دو ہزار روپئے پیش کیے، دیوبند سے پانچ مرتبہ تعاون کی رقم فراہم ہوئی، جو ترکی حکومت کے قونصل مقیم ممبئی کو بھیجی گئی، ان میں سے ہر ایک قسط میں طلبہ شامل تھے۔ دیوبند کے ضلع سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا محمد مظہر نانوتوی وغیرہ اس کی راہنمائی فرمارہے تھے اور گنگوہ میں اس تحریک کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ- کی سرپرستی ونگرانی حاصل تھی، اس لیے ان علاقوں اور ان کے اطراف سے بڑا چندہ ہوا، جو کئی قسطوں میں قونصلر حکومتِ ترکی کو ممبئی بھیجا گیا۔ ان قسطوں کی تفصیلات اور قونصلر کی طرف سے رسیدیں اور شکریہ کے خطوط ایک دستاویز "روداد چندۂ بلقان بہ سرپرستی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی" میں موجود ہیں، جسے حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے اپنی کتاب "قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار وباقیات" میں شامل کر کے شائع کیا ہے۔

اس تحریک کو پورے ملک سے جو تعاون ملا وہ غالباً ہندوستان کی اس وقت تک کی ملی تاریخ کا سب سے

پہلا اور عظیم ترین تعاون تھا، وہ رقم جو ہندوستان کے بے کس، غریب مسلمانوں نے گھر گھر، بستی بستی سے جمع کر کے بھیجوائی تھی وہ بارہ لاکھ روپئے تھے[۱]، جو اس زمانے کے لحاظ سے تو بہت بڑی رقم تھی، اس زمانے کے اوسط اور قوتِ خرید کو دیکھئے تو یہ رقم آج کل کے لحاظ سے دس کروڑ سے بھی زائد ہوگی۔ اس قدر بڑی رقم کا فراہم کر لینا آج بھی آسان نہیں، مگر یہ حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کی حمیتِ دینی اور ان کے جذبۂ اخلاص کا اثر تھا کہ عام مسلمانوں کی طرف سے یہ بڑی مہم سرانجام پائی۔ اور چندہ کی اس خطیر رقم کے بارے میں حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی لکھتے ہیں کہ: "میرا خیال ہے کہ اس رقم میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی اہلیہ کے زیوروں کی قیمت بھی شامل تھی"۔[۲] جس کی مالیت تقریباً دو لاکھ روپے تھی۔ یقیناً یہ حضرت نانوتویؒ کے ملتِ اسلامیہ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے جذبہ کا اثر تھا ورنہ کسی عورت کے لیے اپنے اس قدر مہنگے زیورات سے دستبردار ہونا کوئی آسان بات نہیں تھی۔

اعانت و مدد کی دوسری شکل

اس اعانت و مدد کی دوسری شکل یہ تھی کہ خود موقع پر میدان جنگ میں جا کر اس جماعت اور قافلۂ جہاد میں شریک ہوں، قافلۂ ایمان کو اپنے لہو سے سیراب کریں اور چمن اسلام کو اپنی جان دے کر شاداب فرمائیں؛ لیکن عوام کو اس کی ترغیب نہیں دی گئی اور ان کے لیے مالی تعاون کو کافی سمجھا گیا، جیسا کہ ان کی تحریروں میں صاف طور پر اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اب اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے سب سے بہتر صورت یہی ہو سکتی تھی کہ سفر حجاز پر جائیں اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ کر کے سفر کے دوسرے مرحلے کی تیاری کریں؛ اس لیے سفر حج کا ارادہ کر لیا گیا اور اس کارواں میں جو نئی منزلوں کا مسافر بن کر سفر کے لیے روانہ ہو رہا تھا، نامور علماء کی کثیر تعداد شریک تھی۔ اس سفر سے متعلق روایات و اطلاعات اگرچہ واضح نہیں ہیں کہ یہ سفر کیوں اور کن مقاصد کے لیے ہو رہا تھا، مگر اس کا عام طور سے اندازہ تھا کہ علماء ہند جہاد کے ارادے سے سفر حج پر جا رہے ہیں؛ اس لیے جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی لوگ جوق در جوق ان حضرات کی رفاقت کے لیے کھڑے ہوئے اور ایسا رجوع عام ہوا کہ ساتھ جانے کے لیے سو سے زائد اصحاب شروع سفر سے ساتھ تھے۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی تحریر فرماتے ہیں۔

> "عام اہل اسلام نے جب دیکھا کہ دفعتاً خلاصۂ ہندوستان بجانب حجاز جا رہا ہے اور اس وسیع ملک کی سرتاپا چمکدار نورانی مشعلیں عرب کی طرف روانہ ہو رہی ہیں، تو ایک ہلچل مچ گئی اور جس سے بھی ہو سکا وہ معیت و ہمرکابی کے لیے تیار ہو گیا، اس لیے کہ بطور خود لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو

گیا کہ یہ حضرات دینی معاونت کے لیے بہ حیلۂ سفرِ حجاز حقیقت میں ملک روم کا سفر کر رہے ہیں۔ ترکی سلطنت کی طرف سے والنٹیر جماعت میں شامل ہو کر مجاہد فی سبیل اللہ بنیں گے اور جس کے نصیب میں مقدر ہے جامِ شہادت پی کر حیاتِ ابدی حاصل کرے گا۔" [1] یہاں رک کر ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب لوگ اسی خیال سے اس سفر میں ساتھ جا رہے تھے اور قافلہ سالار اصحابِ علم وفضل کو اس کا خوب علم بھی تھا کہ ان سب کو یہ خبر ملی ہے اور یہ اسی مقصد سے ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں؛ لیکن اگر یہ اطلاع غلط تھی، تو یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ حضرات علماء کرام نے جان بوجھ کر سچ بات کو چھپایا ہو یا اپنے متوسلین اور مخلص نیک مسلمانوں کو اندھیرے یا فریب میں رکھنا پسند کیا ہو۔ بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اطلاع صحیح تھی اور زبان خلق نقارۂ خدا کی ترجمان تھی۔

حضرت نانوتویؒ نے مسلمانوں کی غیرت کو کس طرح جگایا اور اپنے سینے میں لگی ہوئی آگ کی حرارت سے لوگوں کے دلوں میں موجزن ایمان کی چنگاری کو کس طرح سلگایا، اس کا کچھ اندازہ حضرت کی تحریروں سے ہوتا ہے؛ کیوں کہ انھوں نے ترکی کی حمایت کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر اور علم واستدلال کی روشنی میں کیا تھا اور اس سلسلے میں مسلمانوں کی غیرتِ دینی کو جگانے اور پوری ملت کو آواز لگانے کے لیے انھوں نے تین تحریریں بھی لکھی تھیں، ان میں سے دو تحریریں مولانا نور الحسن راشد صاحب نے اپنی کتاب "قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار وباقیات" میں شامل کر کے شائع کی ہیں اور ایک کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ مجھے نہیں ملی۔ چوں کہ حضرت کی ان تحریروں میں علم کی گہرائی، استدلال کی ندرت وقوت کے ساتھ ساتھ دینی حمیت، ملی غیرت، جذبۂ جہاد اور جہد وعمل کی ایک داستان اور دفتر پوشیدہ ہے؛ اس لیے بطور نمونہ اس کے دو اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس کتابچہ میں حضرت نانوتویؒ نے سب سے پہلے ترکی پر روس کی یورش اور اس کے نقصانات کا تذکرہ کیا ہے پھر مسلمانوں کی دینی غیرت کو جگاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"دنیا چند روز ہے یہ وقت پھر نہ ملے گا، اگر کسی اور وجہ سے تم کو حرارت نہیں آتی تو کیا یہ بات بھی باعثِ سرگرمی نہیں کہ مکہ معظّمہ میں خانۂ کعبہ اور مدینہ منورہ میں روضۂ مطہرہ جو اس عزوشرف کے ساتھ آج تک موجود ہیں، تو سلطانِ روم ہی کے بدولت یہ حفاظت ہے۔ اگر خدانخواستہ سلطانِ روم کو بوجہ ہجومِ اعداء اس تنہائی میں شکست ہوئی تو تم ہی کہو کہ پھر ان مقامات متبرکہ کا کیا حال ہو گا، تمہارے اتنے حوصلے نہیں کہ مقابلہ پر جانبازی کرو، اس لیے لازم ہے کہ ان کی اس کفالت کے بدلے کہ وہ مسلمانوں کے پیچھے ان مقامات کی عزت کے لیے اپنی جان ہار بیٹھے، یہاں تک کہ ہزاروں تلف ہو گئے، اتنا ہی کرو کہ تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع کر کے ان یتیموں اور زخمیوں کی

[1] تذکرۃ الرشید، ج:۱، ص:۲۲۳۔

خبر لو۔ علاوہ ازیں سلطان بذات خود مع اپنے شاہزادوں کے در بدر روم کی لڑائی کے لیے چندہ مانگتے پھرتے ہیں، کیا تمہیں اس خبر کو سن کر بھی غیرت نہیں آتی۔ دور دور کے لوگ ترکوں کی ہمدردی اور دردمندی میں بے قرار ہیں، مگر تم کو ہزاروں کے خون اور ہزاروں کے یتیم اور بیوہ ہو جانے کی خبر پر بھی غیرت نہیں۔ اللہ رے صبر و تحمل، اتنے بڑے صدمہ پر نہ اف ہے نہ آہ ہے۔ خداوند قاضی الحاجات حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک سب کی حاجت روائی کرتا رہا؛ بلکہ علاوہ حاجت روائی تمہارے خوشنودیٔ خاطر (کے لیے) کیسی کیسی لذتوں کی چیزیں بنائیں اور اس زمانہ سے لیکر آج تک کبھی دریغ نہ کیا۔ خداوند عالم نے اس زمانہ سے لے کر ایسے ایسے احسان کیے اور کیے چلا جاتا ہے اور تمہارا ہمارا حال یہ ہے کہ جان چراتے پھرتے ہیں، نہ جان دے سکیں نہ مال دے سکیں۔ جب سے ہندوستان میں اسلام آیا اس روز سے لے کر کبھی اسلام کی تقویت یا حفاظت کا خرچ یا حرمین شریفین کی تعمیر یا حفاظت کا خرچ کسی مسلمان کے ذمہ نہیں پڑا، ایک یہ خرچ آیا ہے سو اس میں یہ پہلوتہی ہے۔ کچھ خدا سے حیا کرو، کیا اس کے ان احساناتِ بے پایاں کا یہی بدلہ ہے، کیا اس کے ان انعاماتِ بیکراں کا یہی صلہ ہے، اسی کے مال میں سے اسی کے کام میں دریغ، اس سے زیادہ اور کیا بے حیائی ہوگئی۔ خدا کے کام میں بہانہ مت کرو، ایسا نہ ہو خداوند عالم کسی بہانہ سے اپنے احسانوں میں دریغ کرنے لگے[1]۔"

پوری تحریر کا خلاصہ حضرت الامام ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"اس لیے یہ گزارش ہے اگر خدا کی مغفرت کے امیدوار اور اس کے حبیب ﷺ کی شفاعت کے خواستگار ہو تو حرمین شریفین کی حفاظت میں جان نہیں، مال ہی سے مدد کرو۔ بالکل بے حیا نہ بنو، کچھ تو شرم کرو اوروں سے نہیں شرماتے تو خدا اور رسول ﷺ ہی سے شرماؤ، یوں ہاتھ سے مال جو ہاتھ کا میل ہے، نہیں چھوٹتا، تو ان ننھے ننھے بچوں کی آہ وزاری پر رحم کرو جن کے باپ خدا کی راہ میں خاک وخون میں تڑپ تڑپ کر مر گئے، ان بیویوں کی بے کسی ہی پر رحم کرو، جن کے خاوندان کو چھوڑ کر خدا کی راہ میں اپنا جان ومال نثار کر گئے، یوں بھی غیرت نہیں آتی، تو یہی خیال کرو کہ ہزاروں غرباء نے باوجود افلاس اپنا پیٹ کاٹ کر تھوڑا تھوڑا کر کے ہزاروں روپیہ جمع کر دیئے۔۔۔ اور بھی کچھ نہیں ہوسکتا تو زکاۃ ہی عنایت کرو، ایسے مصارف میں زکاۃ بھی

---

[1] قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ احوال وآثار وباقیات، ص ۱۱۱-۱۱۴ (کمپوز) ص: ۱۳۴- (عکس تحریر)۔
[2] حوالہ سابق، ص: ۱۱۵ (کمپوز) ص: ۱۳۷-۱۳۸ (عکس)

جائز ہے الغرض بہانوں کو جانے دو۔ وقتِ ہمت ہے ٹلانے کا وقت نہیں۔" ۲؎

یقیناً حضرت نانوتویؒ کے مذکورہ کارناموں اور تحریروں سے ان کے اسلام پر مر مٹنے کے جذبے اور باطل کے مقابلہ کے لیے فولادی عزم وحوصلے کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے اور اس دعوے کی بھی تصدیق ہوجاتی ہے کہ ان کو دونوں رشتوں (نسبی وروحانی) سے حضرت صدیق اکبرؓ کی حمیتِ دینی اور غیرت اسلامی کا وافر حصہ ملا ہوا تھا۔

آج جب کہ پوری دنیا میں صہیونی اور باطل طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے انتھک کوششیں کررہی ہیں، پورا عالم اسلام ان کے نرغے میں ہے اور خود ہمارے ملک ہندوستان میں برہمنی شاطر دماغ صہیونی لابی کے ساتھ ساز باز کرکے مسلمانوں کے لیے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور فکری ہر اعتبار سے دائرہ تنگ سے تنگ کرتا جارہا ہے اور بظاہر وہ روز بروز اپنے مشن اور مقصد میں کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے فسادات کروا کر سینکڑوں کی تعداد میں ہمیں موت کی نیند سلا دیتا ہے، ہمارے نوجوانوں کو کسی بھی بے بنیاد الزام میں گرفتار کرکے جیلوں میں ٹھوس دیتا ہے، دھماکے وہ خود کرتا یا کرواتا ہے اور ہمیں مار کر پھر ہم ہی کو مجرم بنا دیتا ہے اور اب تو ہمارے بڑے سے بڑے آدمی پر بھی ہاتھ ڈالنے سے وہ دریغ نہیں کرتا اور ہم ایک عاجز وبے بس کی طرح سوائے چیخنے اور چلانے کے کچھ نہیں کر پاتے یا زیادہ سے گیدڑ بھپتیاں کستے ہیں، جس کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا یا پھر بھیک کا پیالہ لیکر انہی سے حق وانصاف کی بھیک مانگتے ہیں اور وہ سیاسی مصلحتوں کی خاطر کبھی ہمارے پیالہ میں کچھ بھیک ڈال دیتا ہے تو ہم اسی کو اپنی کامیابی سمجھنے لگتے ہیں اور خوشی کے شادیانے بجا کر ہر ایک سے دادِ تحسین وصول کرنا چاہتے ہیں۔ سیاسی طور پر ہماری کوئی حیثیت رہ گئی ہے نہ سماجی طور پر، صرف ہم ایک قلی کی طرح کسی کو اتارنے اور دوسرے کو بٹھا دینے میں مدد کر دیتے ہیں، خود ہم سفر کرنے کے اہل نہیں بنتے یا بننا نہیں چاہتے۔ تعلیمی نظام میں ہمارا کوئی رول نہیں ہے جب کہ اسی سے فکری ڈھانچہ تیار ہوتا ہے، جس کا فائدہ اٹھا کر برہمنی لابی اپنے مخصوص نظریہ کے فروغ کے لیے اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی نفرت پر مبنی نصاب ونظام کو کئی صوبوں میں عملی جامہ پہنا چکی ہے اور ملکی پیمانے پر اس کو لاگو کرنے کی بھرپور کوشش کررہی ہے اور ہم صرف مدارس کی حد تک کام کرنے کو اپنا فریضہ سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے ہیں حالاں کہ مدارس میں پڑھنے والے صرف مسلم گھرانوں کے ۴/ فیصد سے بھی کم بچے ہیں اور ان کو بھی ہم صحیح تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہیں، چہ جائے کہ ہم اپنی پوری نئی نسل کی فکری اعتبار سے حفاظت کرنے میں کامیاب ہوں اور پھر اگلا قدم بڑھا کر اپنے برادرانِ وطن کو غلط اور صحیح کی پہچان کرا سکیں اور ان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں

ایک منصوبے کے تحت پھیلائی جارہی ہیں، ان کو دور کرسکیں۔ اسی طرح معاشی اور اقتصادی اعتبار سے بھی ہم انتہائی پچھڑے ہوئے ہیں، اس پر بھی اُسی لابی کا قبضہ ہے اور وہ جان بوجھ کر ذرائع معاش کے اچھے مواقع اور اہم عہدوں تک ہمارے قابل ہونہار نوجوانوں کو (جو کہ بہت کم ہیں) بھی پہونچنے نہیں دیتا۔ خلاصہ یہ کہ ہر شعبۂ زندگی میں اُس برہمنی شاطر دماغ نے بڑی چالاکی سے اپنا قبضہ جمارکھا ہے اور ہمیں مسلسل پیچھے ڈھکیلتا جارہا ہے، جس کی وجہ سے صرف ہم ہی نہیں بلکہ بہت سے غریب بھولے بھالے لوگ بھی ظلم وستم کی چکی میں پس رہے ہیں اور حق وانصاف کی بھیک مانگ رہے ہیں نیز ان کی امیدیں ہم سے بھی وابستہ ہیں اور ہم ہیں کہ اپنی غفلت اور خودغرضی ومفاد پرستی کے دبیز پردوں کو چاک کرکے باہر آنے کا نام نہیں لیتے۔

ان حالات کو بیان کرنے کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ ہم مایوس ہوجائیں اور ہتھیار ڈال دیں؛ کیوں کہ حالات تو آتے رہتے ہیں اور انہی حالات سے گزر کر یہ امت ہمیشہ کامیابی کی منزلیں طے کرتی رہی ہے اور نہ العیاذ باللہ کسی پر تنقید یا کسی کی تنقیص ہے کہ دین کا کوئی کام کرنے والا ہی نہیں ہے۔ الحمدللہ کام ہورہا ہے اور جو کچھ ہورہا ہے وہ بھی بہت غنیمت ہے اور یہ عاجز تہِ دل سے دین وملت کے تمام خدمت گزاروں کا قدردان اور شکرگزار ہے؛ بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ ان حالات میں ہم اپنے اندر حضرت صدیق اکبر کے جذبہ "أینقص الدین وأنا حيّ" کی کوئی چنگاری سلگانے کی بھرپور کوشش کریں اور ماضی قریب کے اپنے محسن اور خصوصاً برصغیر ہند میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کی حفاظت کرنے والے بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی زندگی کو اپنا آئیڈیل بنا کر دین وملت کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کردینے کا فیصلہ کریں اور حق وانصاف کی لڑائی لڑنے اور اپنے حریف یعنی باطل کو شکست دینے کے لیے پوری ہمت وحکمت سے کام لیں؛ کیوں کہ جب تک ہمارے اندر دینی حمیت اور اسلامی غیرت بیدار نہیں ہوگی اور ہم ظلم وباطل کو اپنا مدِمقابل بنا کر اس سے لڑنے کے لیے کمربستہ نہیں ہوں گے، اس وقت تک ہماری صفوں میں اتحاد واتفاق پیدا نہیں ہوگا جو ہماری کامیابی کی اصل کنجی ہے، شاید (واللہ اعلم بالصواب) اسی لیے اللہ تبارک وتعالی نے صحابۂ کرام کے اوصاف بیان کرتے ہوئے "رُحَماءُ بَیْنَھُم" سے پہلے "أَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ" کا تذکرہ کیا ہے؛ کیوں کہ یہ بات انسانی فطرت میں داخل ہے کہ وہ کسی کو شکست دینا چاہتا ہے اور جب اس کا حریف باطل بن جاتا ہے تو پھر وہ اپنوں کے ساتھ شیروشکر ہوجاتا ہے۔ اللہ ہمیں ہوش کے ناخن لینے کی توفیق دے اور اپنے دین کا درد وغم عطا فرما کر اس کی خدمت کے لیے قبول فرمالے (آمین)۔

☆☆☆

الفرقان کی ڈاک

فائز المرام قابل صد احترام حضرت والا دامت برکاتہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آنجناب پوری طرح بخیر وعافیت ہونگے۔

بعدہٗ؛ یوں تو الفرقان کا ہر ماہ کی آخری تاریخوں میں بڑی شدت سے انتظار رہتا ہے، لیکن جب رمضان المبارک کے بعد خانقاہ نیرل کی حاضری کی سعادت ملی تو ایک اشتہار پر نظر پڑی ''**ملک کا نیا منظر نامہ اور مسلمانانِ ہند کی حکمت عملی**'' کے عنوان سے خصوصی شمارہ آنے والا ہے تو دل میں اسی وقت اس کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا، فوراً اس کی رقم بھی جمع کروادی۔ اب الحمدللہ الفرقان کا خصوصی شمارہ اپنی سابقہ تمام تر خوبیوں سے مالا مال ہوکر گناہگار کے ہاتھوں میں پہونچا تو خوشی کا ٹھکانا نہ رہا، اس کے تمام ہی مضامین ومقالات ذہن کو تسکین اور فکر ونظر کو بالیدگی عطا کرتے ہیں، منتخب علماء کرام کے منتخب مضامین کی جتنی ستائش کی جائے اتنا ہی کم ہے۔

۸۰ سالوں سے الفرقان قرآن وحدیث کی روشنی میں افراط وتفریط سے دور رہ کر راہِ اعتدال کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی جو خدمت انجام دے رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، یہ اسی کا طرۂ امتیاز ہے، اور مستزاد یہ ہے کہ حضرت والا کا اداریہ عالم اسلام اور حالات حاضرہ کی عکاسی کرتے ہوئے سب مسلمانوں کو خصوصاً مسلمانانِ ہند کو راہِ عمل متعین کرنے میں کافی معاون ومددگار ثابت ہوتا ہے، اللہ پاک آپ کی سعی مبارکہ کو عرصہ دراز تک جاری وساری رکھے آمین۔

آخر میں حضرت والا دامت برکاتہم اور پورے ادارۂ الفرقان کو اس خصوصی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد ہے، ادباً عرض ہے کہ خط کی طوالت اور خط میں بندے سے کوئی گستاخی آپ کی شان میں ہوگئی ہو تو بہت ہی معافی کا طلبگار ہے، خصوصی دعاؤں کا محتاج ہے، اللہ پاک اخلاص اور استقامت کے ساتھ اپنے دین متین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین **متعنا اللہ بطول حیاتکم وعلومکم**

فقط والسلام

محمد جاوید سعادتی کرناٹکی۔ 80955692121

خاص نمبر کے سلسلہ میں آپ کی پسندیدگی کا شکریہ! بہت ضرورت اس بات کہ ہے کہ خاص نمبر کے ذریعہ جو فکر پیش کی گئی ہے اسے زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہونچانے کی بھرپور کوشش ہو۔۔ **(مرتب)**